جولائی 2020ء

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

سرپرست اعلیٰ
وچیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

بیک وقت "انگریزی" اور "اردو" زبان میں لندن سے شائع ہونے والا جریدہ

5 جولائی مارشل لا اور پاکستان

صفحہ 5

ماہانہ لاہور انٹرنیشنل: ادبی، سیاسی، سماجی ومذہبی سرگرمیوں کا ترجمان

www.lahoreinternational.com

ZINGMAAR

EASY TO FOLLOW
UNIQUE RECIPES FROM
AROUND THE WORLD

FOLLOW @ZINGMAAR

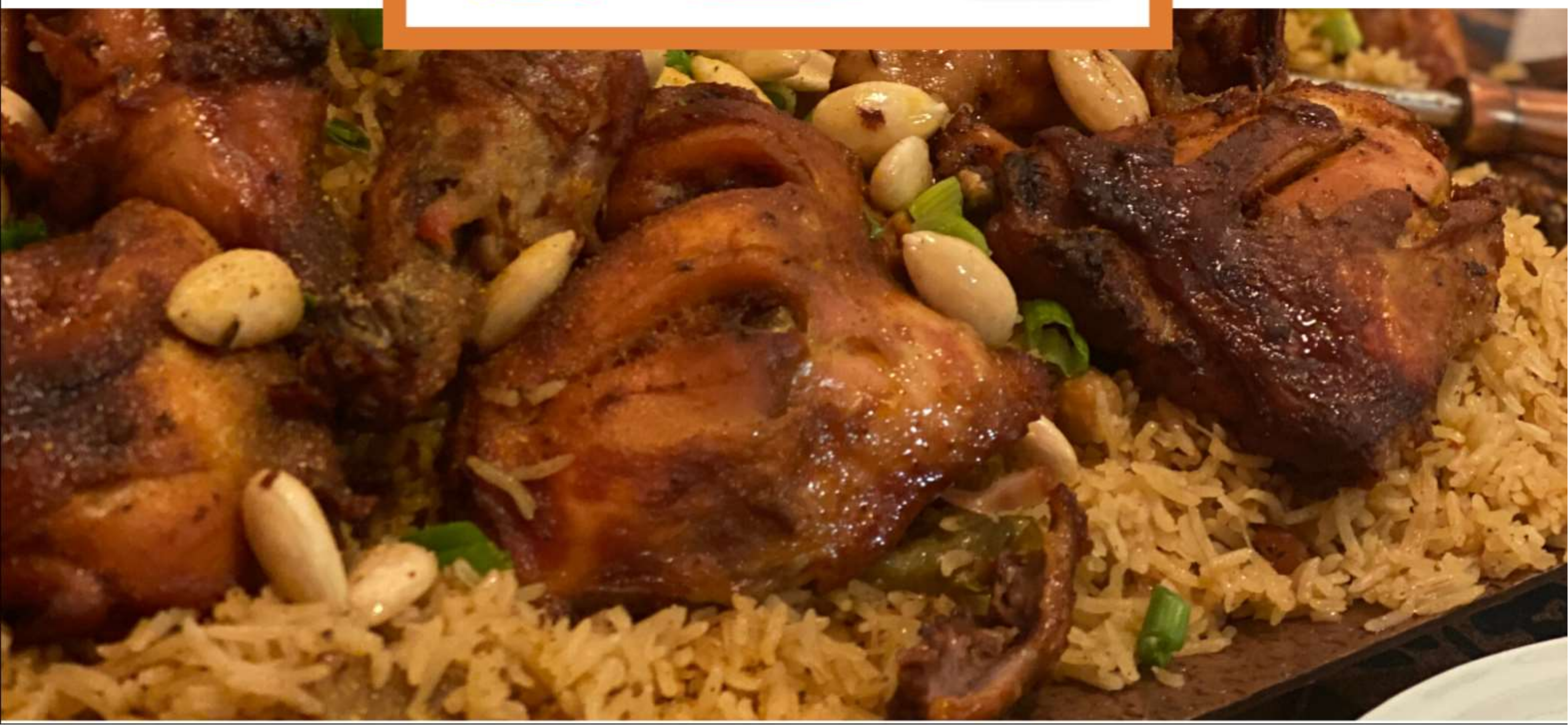

خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ

ھُوَالــــــــــــــــناصر

بعد از خُدا بعشقِ محمدؐ مخمرم   گر کفر ایں بود بخُدا سخت کافرم

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ

جلد نمبر: 3 شمارہ نمبر 1 جمادی الاوّل 1441 جنوری 2020ء

زیر انتظام

عباسی اکیڈمی

ایڈیٹر

منزہ خان

سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈیٹر

محی الدین عباسی

انچارج گوشہ ادب

مدثرہ عباسی

ہمارے نمائندگان

سید مبارک احمد شاہ (ناروے)
+47-91698367

ابن الامین (برطانیہ)
+44-7940077825

عرفان احمد خان (جرمنی)
+49-1711974701

بلال طاہر (کراچی، پاکستان)
+92-3327051887

ظہیر الدین عباسی (جرمنی)
+49-15212005548

محمد ثناء اللہ (بیورو چیف وسطی پنجاب)

محمد سلطان قریشی (کینیڈا)
+41-6433112

چوہدری مقبول احمد (بھارت)
+91-9988489365

قیمت فی شمارہ: 2 پاؤنڈ

website : lahoreinternational.com

اپنی تحریریں اور قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:

lahoreintlondon@gmail.com

m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ **لاہور** میگزین انٹرنیشنل آپ کا اپنا رسالہ ہے
اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیئے۔

اس شمارہ میں

04 درسِ قرآن کریم
05 کرونا وائرس کے بعد دنیا کا مستقبل کیا؟
07 خلل اور اختلال کے درمیان صحافت
09 فری لانسنگ اور فراغت کے یہ دن
11 چودھریوں کا چھپا دشمن؟
13 لاہور کی مسجد شب بھر (مسجد شہید)
15 شیعہ مراجع کی تاریخ، مذہبی حیثیت اور سیاسی اثر و رسوخ
20 مریض کی عیادت اور ہم
22 کشمیر: یہ لہو چھپائے نہ چھپے گا، یہ بغاوت دبائے نہ دبے گی
26 منافقت سے چھٹکارا
27 میں، ہم اور کرونا وائرس
29 غلط فہمی
30 عدم برداشت
31 کرونا عذاب نہیں: پاکستان پر کبھی عذاب نہیں آسکتا
33 پاکستان میں موجود دنیا کی سب سے بڑی ریلوے ٹنل کی حیرت انگیز داستان
34 5 جولائی مارشل لا اور پاکستان
35 پاکستان کا "مسئلہ قادیانیت" کیا ہے اور اس کا حل
38 راجہ داہر کی دو بیٹیاں اور محمد بن قاسم کی موت
40 چینی، آٹا چوروں کے بعد پیٹرول چور
41 جسٹس فائز عیسیٰ، پاکستان کی عدلیہ، اور اس کے لٹکتے فیصلوں کی بدنما تاریخ
43 آیئے ملتے ہیں صبر و شکر کرنے والوں سے!
44 این اے 35 بنوں: تحریک انصاف کا عالم دین امیدوار اور لال مسجد والا مساج سینٹر
45 میری بے ایمانیاں
46 خواجہ حسن نظامی دہلوی کا سفرنامہ پاکستان
47 کمیونسٹ انٹرنیشنل کے سو سال
51 صحرائے صحارا: سوڈان کا وہ مقام جو ماحولیاتی تبدیلی کے صدیوں پرانے راز چھپائے بیٹھا ہے
53 پھٹی ہوئی شلوار اور ٹک ٹاک کا "پرینکستان"
56 وہ اشعار جو علامہ اقبال کے نہیں ہیں مگر اُن کے نام سے منسوب ہیں
58 یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں
59 حسن مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے
59 گھر کی رونق

ADVERTISEMENT TARIFF

(Effective : January 01, 2018)

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

درس قرآن کریم

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ۔ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ فِیۡ شِیَعِ الۡاَوَّلِیۡنَ۔ وَ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ۔
کَذٰلِکَ نَسۡلُکُہٗ فِیۡ قُلُوۡبِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ۔ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ وَ قَدۡ خَلَتۡ سُنَّۃُ الۡاَوَّلِیۡنَ۔ وَلَوۡ فَتَحۡنَا عَلَیۡہِمۡ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوۡا فِیۡہِ یَعۡرُجُوۡنَ۔ لَقَالُوۡۤا
اِنَّمَا سُکِّرَتۡ اَبۡصَارُنَا بَلۡ نَحۡنُ قَوۡمٌ مَّسۡحُوۡرُوۡنَ۔

(سورۃالحجر آیت10 تا16)

ترجمہ: یقیناً ہم نے ہی یہ ذکر اُتارا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اور ہم نے تجھ سے قبل بھی گرہوں میں بھی (رسول) بھیجے تھے۔ اور کوئی رسول ان کے پاس نہیں آتا تھا مگر وہ اس سے تمسخر کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ہم مجرموں کے دلوں میں اس (بیباکی) کو داخل کرتے ہیں۔ وہ اس (رسول) پر ایمان نہیں لاتے حالانکہ اس سے پہلے لوگوں کا مآل گزر چکا ہے۔ اور اگر ہم آسمان کا کوئی دراُن پر کھول دیتے پھر وہ اس پر چڑھنے بھی لگتے (تا کہ بچشمِ خود رسول کی صداقت کا نشان دیکھ لیتے)۔ تب بھی وہ ضرور کہتے کہ ہماری آنکھیں تو (کسی نشے سے) مدہوش کر دی گئی ہیں بلکہ ہم تو ایک ایسی قوم ہیں جن پر جادو کر دیا گیا ہے۔

(ترجمہ حضرت مرزا طاہر احمدؒ)

تشریح: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے یہ ابدی ہے۔ جب بھی قرآن کریم کی طرف غلط معنے منسوب کئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کسی روحانی وجود کو ان کی اصلاح کے لئے مبعوث فرما دیتا ہے۔

’’استغفار‘‘ کے مختصر معنی

جب انسان کوئی غلطی کرتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے کسی حکم اور قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ غلطی اور کمزوری اس کی راہ میں روک ہو جاتی ہے اور یہ عظیم الشان فضل سے محروم کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس محرومی سے بچانے کے لئے یہ تعلیم دی کہ استغفار کرو۔ استغفار انبیاء علیہم السلام کا اجماعی مسئلہ ہے۔ ہر نبی کی تعلیم کے ساتھ اَسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ رکھا ہے ہمارے امام کی تعلیمات میں جو ہم نے پڑھی ہیں استغفار کو اصل علاج رکھا ہے۔ استغفار کیا ہے؟ پچھلی کمزوریوں کو جو خواہ عمداً ہوں یا سہواً غرض مَا قَدَّمَ وَ مَا اَخَّرَ نہ کرنے کا کام آگے کیا اور جو نیک کام کرنے سے رہ گیا ہے۔ اپنی تمام کمزوریوں اور اللہ تعالیٰ کی ساری رضامندیوں کو مَا اَعۡلَمُ وَ مَا لَا اَعۡلَمُ کے نیچے رکھ کر اور آئندہ غلط کاریوں کے بدنتائج اور بد اثر سے محفوظ رکھ اور آئندہ کے لئے ان جوش سے محفوظ فرما۔ یہ ہیں مختصر معنے استغفار کے۔

(الحکم 26 فروری 1908ء صفحہ 302)

مدیر اعلیٰ محی الدین عباسی

ادا ریہ

کرونا وائرس کے بعد دنیا کا مستقبل کیا؟

کبھی رحمتیں تھیں نازل اسی خطہ زمیں پر
وہی خطہ زمیں ہے کہ عذاب اُتر رہے ہیں

کرونا وائرس دنیا میں پھیلتا جا رہا ہے اب تک 188 ممالک اس کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔ 4 لاکھ 70 ہزار ہلاکتیں اور 90 لاکھ افراد اس سے متاثر ہو چکے ہیں۔ برازیل ، میکسیکو ، انڈیا اور پاکستان میں یہ وباء مزید پھیلتی جا رہی ہے اس ضمن میں قارئین کی خدمت میں مختصراً تجزیہ پیش خدمت ہے۔ ماہرین تجزیہ کار اور مالیاتی ادارے اس وباء اور اس کے نتیجے میں ہونے والے لاک ڈاؤن کو مُوردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ لیکن سنجیدہ حلقے اس بات کا اعتراف کر رہے ہیں کہ کرونا وائرس نہ بھی ہوتا تب بھی عالمی معیشت کو کنواں میں گرنے کے لئے محض ایک بہانہ چاہئے تھا۔ ''عالمی مارکسی معیشت'' رجحان نے اپنی ستمبر 2019ء کی عالمی تناظر کی دستاویز میں خبردار کیا تھا کہ امریکی چین تجارتی جنگ ، مشرقِ وسطیٰ میں نیا تصادم ، کوئی وباء ، کوئی دیوالیہ اور یہاں تک کہ امریکی صدر ٹرمپ کا ایک بیوقوفانہ ٹویٹ بھی نئی عالمی معاشی بحران کو جنم دے سکتا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب امریکہ اور چین جیسی معیشتوں کے GDP کی پہلی سہ ماہی میں بالترتیب 40 فیصد اور 30 فیصد گراوٹ اور تیل کی عالمی قیمت مستقل طور پر 10 ڈالر یا اس سے کم رہنے کی پیشن گوئیاں کی جا رہی ہیں۔ آنے والے دنوں میں سعودی عرب جس کی معیشت عمرانی معاہدہ خارجہ پالیسی اور حکمران طبقے کی عیش و عشرت کی بنیاد کا مستقبل ہے۔ وہاں شہزادوں ، حکمرانوں کی بے جا شاہ خرچیوں کے باعث حالات ابتر ہیں۔ عالمی منڈی میں پر نیٹ خام تیل کی قیمت بھی 16 ڈالر فی بیرل تک گرنے کے بعد اب 34 ڈالر فی بیرل پر کھڑی ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ ان قیمتوں کی موجودگی میں امریکی شیل انڈسٹری کی 80 فیصد کمپنیاں دیوالیہ ہو جائیں گی۔ جبکہ منافع بخش نہ ہونے کی صورت میں یہ پوری صنعت ہی بند ہو جائے گی۔ اس کی وجہ لاک ڈاؤن اور عالمی معاشی بحران کے باعث عالمی منڈی کی مانگ تاریخی گراوٹ (30 فیصد یا 30 بلین بیرل یومیہ) روس اور سعودی عرب چند ہفتوں کی محدود پیمانے پر تیل کی منڈی میں مارکیٹ شیئر کے لئے تجارتی جنگ ہے۔ دیکھا جائے تو یہ بحران صرف ایک صنعت تک محدود نہیں ہے۔ قیمتی دھاتوں (سونا چاندی) کی قیمتوں میں حیران کن گراوٹ سے لے کر دنیا بھر میں اسٹاک مارکیٹوں میں انتشار (مجموعی طور پر 30 فیصد گراوٹ) تیزی سے دیوالیہ ہوتی کمپنیاں ، بینک ، ایئر لائن صنعت اور ہوٹل اور کئی اہم سوشل ادارے 1929ء کے '' عالمی کریش '' سے کئی گناہ بڑے سرمایہ دارانہ بحران کی نوید سنا رہے ہیں۔ مجموعی طور پر کئی ٹریلین ڈالر منڈیوں سے صفاچٹ ہو چکے ہیں۔ عالمی مالیاتی اداروں نے کئی ملکوں کو مالیاتی امداد دینے کا اعلان کیا ہے؟ لیکن یہ کارگر ثابت نہیں ہوگا۔ دنیا کے کئی حکمران بالخصوص مسلمان ممالک کے لئے یہ ایک کہاوت صادق آتی ہے۔ '' مشہور یونانی کہاوت ہے کہ جس کے مطابق جب دیوتا کسی کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو اسے پاگل کر دیتے ہیں۔ '' راقم الحروف نے اپنے پچھلے کالم میں یہ بات باور کروائی تھی کہ کرونا وائرس پوری دنیا کی ترقی معیشت طشت از بام کر دی ہے۔ کیا یورپ کیا ایشیا اور مشرق وسطیٰ تمام بڑی طاقتیں اس کے آگے بے بس دکھائی دیتی ہیں۔ یہ بات صاف نظر آ رہی ہے کہ کوئی ملک آسمانی و زمینی آفات سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس وباء نے جہاں ترقی یافتہ ممالک کی معیشت کو بُری طرح متاثر کیا ہے وہیں ترقی پذیر ممالک بھی اسی کی زد میں ہیں۔ دنیا بھر میں سرکاری و غیر سرکاری ادارے بند ہونے کی وجہ سے ملازمتی مواقع بند ہو گئے ہیں۔ اور لاکھوں افراد بے روزگار ہو چکے ہیں۔ دنیائے زندگی کے اہم اداروں نے اپنے ملازمین کو فارغ کر دیا ہے۔ اور اپنے بجٹ میں کٹوتی کر دی ہے۔ حکومتوں نے اپنی عوام کو جو سہولتیں دی تھیں وہ واپس لینا شروع کر دی ہیں۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے آئندہ آنے والے دنوں میں کھانے پینے اور روزمرہ ضروریاتِ اشیاء کی کمی واقع ہو رہی ہے جس کے باعث مہنگائی بڑھ رہی ہے۔ ماہرین معاشیات ، ذرائع ابلاغ ، تجزیاتی رپورٹ کے مطابق لاک ڈاؤن کے طویل ہونے کی وجہ اور اس کے بعد کی صورتحال کی وجہ سے دنیا میں بدترین معاشی بحران پیدا ہو جائے گا۔ عالمی خوراک کے ادارے نے کہا ہے کہ آنے والے دنوں میں کرونا وائرس نے مزید تکلیف دہ اثرات ظاہر ہونے کے خدشات موجود ہیں۔

ورلڈفوڈ پروگرام کے ڈائریکٹر کا کہنا ہے کہ دنیا کو آنے والے دنوں میں انسانی ہمدردی کے شدید بحران کا سامنا ہوسکتا ہے۔اور تین درجن ملکوں میں قحط پڑسکتا ہے اور یہ کہ دیوالیہ بھی ہوسکتے ہیں۔قیاس یہ کیا جارہا ہے کہ دنیا کے اہم ممالک کو اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے لئے کئی سال درکار ہوں گے اور چھوٹے ممالک کا تو بُرا حال ہوگا۔عالمی مالیاتی ادارے اب قرضہ دینے کے لحاظ سے بہت محتاط رہیں گے۔کرونا وائرس کا علاج اب تک دریافت نہیں ہوا چند دواساز کمپنیوں نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ کسی حد تک کامیاب ہوگئے ہیں۔پس تسلی کی حد تک ہے حالانکہ ذرائع یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ وائرس وباء کا مکمل خاتمہ کا امکان نہیں جبکہ اس کے اثرات باقی رہیں گے۔اس ضمن میں دنیا کے مختلف تجزیہ کار، سائنسدان اور ماہرین کی رائے اور تنبیہہ ہے کہ یہ خطرناک وائرس جنیاتی تبدیلیوں کے عام ہونے کا بہت رجحان ہے اور ایک نئے کرونا وائرس کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔ایک ماہر کا خیال ہے کہ ہر تین سال بعد نئی بیماری وائرس آجائے گا اور دوسرے کا خیال ہے کہ کرونا وائرس پر قابو پایا تو جاسکتا ہے لیکن وبائی امراض کے خلاف انسانیت کی جنگ نہ ختم ہونے والی جنگ ہے۔انسانیت اور جرثیموں کے مابین ارتقا کی دوڑ میں کیڑے دوبارہ آگے آ رہے ہیں۔

کرونا وائرس آج انسانی سلامتی کو متاثر کرنے والی صحت کا ایک عالمی مسئلہ ہے اور یہ عالمی سیاست، سلامتی اور اقتصادی مرکزی معاملات میں اس کی اہم حیثیت ہے۔عالمی معیشت اس وقت جمود، کساد بازاری سے دوچار ہوچکی اگر حالات اسی ڈگر پر رہے تو ممکن ہے آئندہ چند برسوں تک عالمی معیشت میں بہتری کا امکان نہیں۔علاوہ ازیں اس وباء کا عالمی نظام سے تعلق رکھنے والا ایک دوسرا پہلو عالمی سلامتی سے براہ راست تعلق ہے۔جبکہ ترکی حکومت کا کہنا ہے کہ ”یہ مسئلہ عالمی سطح کا ہے لیکن جدوجہد قومی سطح پر محیط ہے“ یہ طریقہ کار دوسرے ممالک کو بھی عمل کرنے پر مجبور کررہا ہے۔ ہر ملک اپنے شہریوں کو بچانے کے لئے اپنی اپنی سرحدوں کی حفاظتی تدابیر اُٹھانے پر مجبور ہیں۔فضائی رابطے تو تقریباً بند ہوچکے ہیں۔برطانیہ اور یورپی ممالک ایک مختلف طرز کی حکمتِ عملی پر عمل پیرا ہیں۔فرانس نے اپنے بلدیاتی انتخابات مئوخر کردیئے ہیں۔امریکہ کے صدارتی انتخابات بھی؟ اسپین نے نجی ہسپتالوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا ہے۔امریکہ میں وائرس کے پھیلاؤ کے بعد انفرادی طور پر اسلحہ کی خرید میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔اگر حالات اسی طرح رہے تو افراتفری کا ماحول اولین طور پر قومی سلامتی کے مسائل کے ظہور پذیر ہونے کے بعد ملکوں کے اندر اور بین الاملکتی دیگر مسائل کو جنم دے سکتا ہے۔اس عالمی وباء نے صحت کے علاوہ عالمی اقتصادی وسلامتی دو بنیادی اہم ستون عالمی سسٹم کے مستقبل کا کون سا رُخ اختیار کریں گے یہ آئندہ آنے والے حالات بتائیں گے۔علاوہ اس کا اثر انفرادی نفسیات پر بھی ہوگا۔افراتفری کشمکش کے شکار ہونے والے انسانوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے اور یہ سماجی نفسیات اور برتاؤ پر اثر انداز ہوگا جو کہ سیاسی افراتفری کا موجب بننے والے نتائج کو جنم دے گا۔اس کی مثال پاکستان کے موجودہ سیاسی اور سماجی حالات سے لگایا جاسکتا ہے۔معیاری عمل درآمد اور مثبت لائحہ عمل پر عمل پیرا ہونے والی حکومتیں اس وباء سے کم سے کم سطح پر متاثر ہوں گی۔جبکہ کمزور ممالک اور حکومتیں اس سے بُری طرح متاثر ہوں گی اور ممکن ہے انتہائی سنگین حالات سے دوچار ہوں۔اقوام متحدہ برائے تجارت کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا میں کرونا وائرس کے اثرات سے نمٹنے کے لئے ڈھائی کھرب ڈالر کی ضرورت ہے۔رپورٹ کے مطابق اس کا باعث عالمی کساد بازاری بہت سے ترقی پذیر ممالک کے لئے تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔اور یہ دنیا کی آبادی کا دو تہائی ہے جو کرونا کی وباء کے باعث ایسے معاشی نقصان کا سامنا کررہے ہیں جس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ ایشیائی ترقیاتی بینک کی رپورٹ کے مطابق پاکستان کی معیشت کو کرونا وائرس کی وباء سے پیدا شدہ صورتحال میں 5ارب ڈالر تک کے نقصانات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ان تمام مسائل کے حل کے لئے قرآن کریم نے ہمیں ایک بہترین حل دیا ہے۔

ترجمہ! یقیناً اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اُسے تبدیل نہ کریں جو اُن کے نفوس میں ہے۔اور جب اللہ کسی قوم کے بدانجام کا فیصلہ کرلے تو کسی صورت اس کا ٹالنا ممکن نہیں۔اور اس کے سوا اُن کے لئے کوئی کارساز نہیں۔(سورہ الرعد آیت 12)

اس قرآنی تعلیم کی روشنی میں دنیا کی ساری قوموں کو مل کر اپنے حالات کا جائزہ لینا چاہئے اور ایک خدا (واحد لاشریک) کی طرف لوٹنا ہوگا اور اپنی طرزِ زندگی خدا تعالیٰ کی تعلیمات رسول کریمؐ کے بتائے ہوئے اصولوں، نیک بزرگوں اور وقت کے امام کی آواز پر لبیک کہنا ہوگا۔اسی میں ہم سب انسانوں اور قوموں کی بھلائی اور عافیت ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس وبائی مرض سے جلد دور کرے اور مریضوں کو شفا دے۔آمین

شعبہ پاکستان

خلل اور اختلال کے درمیان صحافت

تحریر: وجاہت مسعود

خلد آشیانی مشتاق احمد گورمانی کی رسمی تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن ذاتی مطالعے سے استعداد یہاں تک بڑھالی تھی کہ سرکاری دستاویز اور سیاسی بیان میں سند مانے جاتے تھے۔ ٹھٹھہ گورمانی، کوٹ ادو کے نواب صاحب نے کم عمری ہی سے منصب اور جاہ وحشم کا ذوق پایا تھا۔ برطانوی ہند میں عہدوں کی سیاست کا راستہ ڈپٹی کمشنر کے دفتر سے ہوکر نکلتا تھا اور افتادگان خاک کی تکریم کو روندتا ہوا مسند اقتدار تک پہنچتا تھا۔ پاکستان کے تمام خطوں میں یہ روایت موجود تھی لیکن اللہ کے فضل سے ہم اہل پنجاب نے اس فن میں بدرجہ اتم دستگاہ پائی۔ دستگاہ منفعت ہے گرچہ ہے بے آبرو...... سرکاری اہل کاروں کے ساتھ نشست و برخاست کا ایک ذیلی اثر یہ ہوتا ہے کہ گلی کوچوں میں بسنے والے انسان حشرات الارض معلوم ہونے لگتے ہیں، ریاست کی قوت نافذہ در استجاب کا درجہ پالیتی ہے۔ بڑے صاحب کی سرپرستی، سازش اور جرم کے اس مہلک محلول سے تخمیر پانے والی سیاست گورمانی، دستی، کالا باغ اور صادق قریشی سے چلتی ہوئی آج کے منظر نامے میں ان اصحاب تک آ پہنچی ہے جن کے نام درویش کو بوجہ عافیت کوشی یاد نہیں رہتے۔ مشتاق گورمانی جن دنوں کشمیر کے معاملات دیکھ رہے تھے، ایک صحافی اپنے فرائض منصبی کے ضمن میں ملاقات کے لئے آئے۔ کسی تیکھے سوال پر گورمانی صاحب نے بلبلا کر کہا کہ صحافی لوگ riffraff (نیچ اور کنگلے) ہوتے ہیں۔ صحافی نے توجہ نہیں دی، ضروری معلومات نوٹ کیں اور رخصت ہوگیا۔ گورمانی صاحب کے سیکرٹری نے بعد میں انہیں بتایا کہ یہ جو صاحب سر جھکائے آپ کی لت پت سن رہے تھے یہ کراچی سے تشریف لائے ہیں، قائداعظم ان سے مشاورت کیا کرتے تھے۔ گورمانی صاحب کی بلا جانے کہ قائداعظم اور بمبے کرانیکل کے ایڈیٹر ہارنی مین میں کیا رشتہ تھا۔ انہوں نے تو تراڑکھل کا ریڈیو اسٹیشن دیکھا تھا۔ ایوب خان کی آزاد صحافت سے شیفتگی سب کو معلوم ہے۔ یحییٰ خان کو ان چونچلوں کی تاب ہی نہیں تھی۔ الطاف گوہر کی گرفتاری پر خالد حسن نے بھٹو صاحب سے الطاف کریمانہ کی درخواست کی تو بھٹو صاحب نے snub کر دیا۔ ضیا الحق نے اہل صحافت پر اپنے کار خاص مجیب الرحمن کو مامور کر رکھا تھا۔ نوے کی دہائی میں بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی حکومتیں بھلے دست تہ سنگ آمدہ کی تصویریں تھیں لیکن محترمہ بے نظیر بھٹو کو بے نظیر صاحبہ کہنے پر اصرار عابدہ حسین کیا کرتی تھیں۔ بے نظیر بھٹو کے گورنر کمال اظفر تاریخ میں اس لئے جانے جائیں گے کہ ان کی نگہ قہر آسا نے ہمیں رضیہ بھٹی جیسی صحافی سے محروم کر دیا۔ پرویز مشرف کی روشن خیالی کون نہیں جانتا۔ لندن میں ایم ضیا الدین کے بارے میں برسر مجلس کہا کہ ایسے صحافیوں کو اگر 'ایک دو' ٹکا بھی دیے جائیں تو برا نہ ہو گا۔ استغفر اللہ۔ 2008 سے 2018 کے عشرے میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نواز کی 'حکومتوں' کا رویہ صحافت سے کسی قدر بہتر رہا۔ شاید اس لئے کہ بے مہار تنقید کرنے والے تو غریب اپنی 'ڈیوٹی' کر رہے تھے۔ سیڑھی کا ایک زینہ چھوڑ کر 'بے باک' صحافت کرنے میں چند در چند فائدے ہیں۔ سیاست دانوں کی بدعنوانی، غفلت اور کوتاہی کے دھڑا دھڑ اسکینڈل بے نقاب کرنے سے صحافی کی دنیا بھی بہتر ہو جاتی ہے اور obituary لکھنے والے کو بھی سہولت رہتی ہے۔

2018 کے بعد اچانک ہم پر صحافت کی خرابیوں کا انکشاف ہوا۔ صحافی لفافے لے کر عزت داروں کی پگڑی اچھالتے ہیں۔ تنخواہ کے عوض قلم کاری کرتے ہیں۔ باقی شعبہ ہائے زندگی میں فی سبیل اللہ خدمت خلق کی جاتی ہے۔ صحافی تو سیٹھ لوگوں کے ملازم ہوتے ہیں۔ یہ یاد کرنے سے کیا حاصل کہ ایوب حکومت نے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے اخبارات پر قبضہ کر کے انہیں سیٹھ داؤد کو سونپ دیا تھا۔ اے صبا ایں ہمہ آوردہ تست۔ اس قصے کو اگر طول دیا تو درویش پر اپنے ان داتا (حال گرفتار بلا) سیٹھ کی نمک حلالی کا الزام آئے گا۔ صحافی کے لئے ضروری ہے کہ عوام کو مونث باندھے اور زیادہ بہتر ہوگا کہ 'عام عوام' لکھے اور بولے۔ اس سے پڑھنے والے کے احساس محرومی میں افاقہ ہوتا ہے۔ نیز اشرافیہ کی مخالفت کرتے رہنا چاہیے۔ اللہ کی شان ہے کہ ایچی سن کالج میں تعلیم پانے اور لاہور کی قدیم حویلیوں میں پاؤں پسارے زندگی گزارنے والے ترک دنیا کے دعویدار ہو گئے ہیں۔ ایک غضب یہ ہے کہ اشرافیہ اور اسٹیبلشمنٹ کی اصطلاحات میں ٹھیک اسی طرح تمیز اٹھا دی گئی ہے جیسے سیکولرازم اور الحاد کو گڈمڈ کیا گیا۔ اشرافیہ سے مراد معاشرے کا وہ طبقہ ہے جو ان سہولتوں سے بہرہ مند ہو رہا ہو جن پر سب شہریوں کا حق ہے۔ اشرافیہ سے تعلق ہونا نہ تو کسی کا شعوری فیصلہ ہے اور نہ جرم۔ سیاست کا منصب ہی یہ ہے کہ محروم طبقات کے لئے ان سہولتوں اور حقوق تک رسائی کو یقینی بنایا جائے جو ایک محدود طبقے کے لئے مخصوص ہو چکے۔ دوسری طرف اسٹیبلشمنٹ ایک ملفوف اصطلاح ہے جو اختیار اور وسائل پر مستقل اجارے کے لئے مجرمانہ گٹھ جوڑ کا نام ہے۔ اسٹیبلشمنٹ اختیار کی مستقل تقسیم کے بندوبست کو کہتے ہیں، جمہوریت وسائل اور فیصلہ سازی کے لئے معاشرے میں پرامن اور سیال تعامل کا نام ہے۔ جمہوری مکالمہ آزاد صحافت کے بغیر ممکن نہیں۔ ان دنوں ہم ایک ایسی حکومت کے زیر سایہ دن گزار رہے ہیں جو جمہوری طریقہ کار سے برسر اقتدار آنے کے باوجود جمہوریت سے کھلے عام نفور کا اظہار کرتی ہے۔ سیاسی عمل ہی کو بے وقعت کرنے پر مصر ہے۔ ایسے میں صحافت سے مخاصمت قابل فہم ہے۔ صحافت کا پیشہ وارانہ منصب واقعہ کے بارے میں حقائق جمع، مرتب اور ترسیل کرنے تک محدود نہیں۔ یہ کام تو کوئی سرکاری

اہل کار بھی کر سکتا ہے۔صحافت کا کہیں زیادہ اہم منصب معاشرے میں انصاف کی صورت حال، کمزور طبقات کے لئے رسائی کے مواقع نیز طاقت اور مفاد کی جگل بندی کی تفسیر کرنا ہے۔ جمہوریت میں خلل پر اضطراب صحافت کا جائز بلکہ لازم وظیفہ منصبی ہے۔ ایسا خلل صرف فرد کے لئے نہیں بلکہ اجتماعی اختلال پر منتج ہوتا ہے۔صحافت قوم کا پیوستہ مفاد ہے۔قوم خلل اور اختلال کے دورانیے سے گزر رہی ہوتو صحافت کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ کچھ روشنی اس میں تو ہے، ہر چند کہ کم ہے۔

❁❁❁

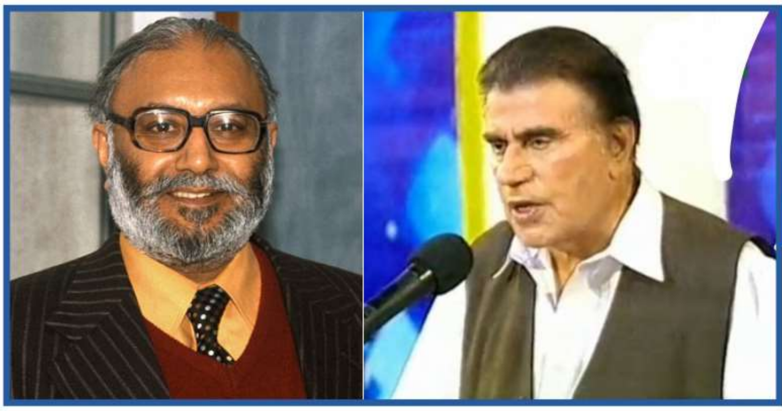

نیلام گھر کا موجد

تحریر: مبشر احمد طاہر ٹرانٹو کینیڈا

کراچی سے مرحوم اظہار حیدر صاحب تھے.جنہوں نے یہ شوشروع کیا تھا پھر وہ ابوظہبی چلے گئے وہاں انہوں نے یو اے ای میں پہلا ریڈیو پروگرام اردو سروس ابوظہبی کے نام سے شروع کیا.نیلام گھر انھیں نے طارق عزیز کو دے دیا. انہوں نے یہ بات ۱۹۸۱ میں مجھے اس وقت بتائی تھی جب مرحوم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب حکومت یو اے ای کی دعوت پر تشریف لائے تھے.ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا ایک لیکچر اسلام اور سائنس پر العین شہر میں یو اے ای کی پہلی یونیورسٹی میں تھا.ایک بات میں یہاں بتاتا چلوں کہ ڈاکٹر عبد السلام صاحب دبئی سمندر کے کنارے ایک ہوٹل حیات ریجنسی میں ٹھہرے ہوے تھے اس دورہ کے دوران ڈاکٹر صاحب کے (پی اے) تھے وہ ڈاکٹر عبد السلام صاحب کے بھانجے کے کلاس فیلو تھے او احمدی نہیں تھے ان کا نام عبدالحی تھا انکی شارجہ میں لینڈ سکیپنگ کی کمپنی تھی اور وہ شارجہ کے موجودہ حاکم شیخ سلطان بن محمد القاسمی کے پارٹنر تھے اور شارجہ ایئرپورٹ کا سارا کام کروا رہے تھے. انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اظہار حیدر صاحب کا انٹرویو کا وقت مقرر کروایا جب اظہار حیدر صاحب انٹرویو کے لئے آئے تو انھیں پتہ چلا کہ دلیپ کمار اور سائرہ بانو بھی اس ہوٹل میں ہیں اور اس وقت ان سے میں انٹرویو کرلوں جلدی سے میں واپس آ کر ڈاکٹر صاحب کا انٹرویو کرلونگا.اظہار حیدر صاحب ابھی نکلے ہی تھے کہ ڈاکٹر صاحب عین وقت پر آ گئے اور اظہار حیدر صاحب کچھ دائر انتظار کرنے کے بعد کو ڈاکٹر صاحب کمرہ میں واپس چلے گئے اور اگلی ملاقات ڈاکٹر صاحب کی شیخ محمد بن راشد المکتوم جو اس وقت وزیر دفاع تھے اب دبئی کے حاکم اور (یو اے ای) کے نائب صدر اور وزیر اعظم ہیں سے ملاقات کیلئے چلے گئے اور عبدالحی صاحب کو کہہ گئے کہ اظہار حیدر صاحب کو منع کر دیں اب اور وقت نہیں ہے.شام کے سات بجے کا وقت تھا. میں نے ایک خط لکھا ہوا تھا جس کے باہر لفافے پر لکھا ہوا تھا میں مبشر احمد طاہر آپکی خالہ بی بی امتہ الرحمن کی بیٹی کا داماد ہوں.اس پر عبدالحی صاحب نے سارا ماجرا سنایا اور کہا کہ آپ اظہار حیدر صاحب کو انٹرویو کا وقت لے کر دیں. ڈاکٹر صاحب رات گیارہ بجے تک واپس آ جائیں گے. ڈاکٹر صاحب گیارہ بجے واپس آئے تو میرا خط دیکھ کر کہنے لگے میرے ساتھ آؤ.میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب آپ کو جو انعام ملا ہے اس کے متعلق کچھ بتائیں کہنے لگے سادہ سا جواب یہ ہے کہ میں نے توحید کے مضمون کو قرآن سے دیکھا اور اس پر کام کیا چار طاقتوں کو ایک میں واپس لانے کی کوشش کی. جو گورنمنٹ یو اے ای نے کلچرل بک ڈاکٹر صاحب کو دی وہ کلچرل بک ڈاکٹر صاحب نے مجھے دی اور اپنی ایک کارڈ سائز تصویر پر سرخ رنگ کے مارکر کے ساتھ آٹوگراف بھی دیا جو میرے پاس ہے عبدالحی صاحب کی سفارش پر خاکسار نے اظہار حیدر صاحب جو پاکستان میں نیلام گھر اور ابوظہبی میں اردو سروس ابوظہبی کے خالق و مالک تھے انٹرویو کا وقت ڈاکٹر صاحب سے لیا ڈاکٹر صاحب کہنے لگے اس کو وقت نہیں دینا یہ مجھے وقت دے کر وقت پر آیا نہیں. میں نے ڈاکٹر صاحب کو ساری بات بتا کر جماعتی حالات بتائے کہ آپکا انٹرویو تبلیغ کے مواقع پیدا کرے گا.ڈاکٹر صاحب راضی ہو گے کہنے لگے ٹھیک ہے اسے وقت دیں کہ پرسوں صبح پانچ بجے بعد نماز فجر ہلٹن ہوٹل العین میں آ جائے اسے بھی ذرا پتہ چلے کہ کوئی چیز بغیر تکلیف کے نہیں ملتی میں نے اظہار حیدر صاحب کو فون کر کے بتا دیا کہ پرسوں صبح ساڑھے پانچ بجے ہلٹن ہوٹل العین پہنچ جائیں ڈاکٹر صاحب نے حامی بھر لی ہے چنانچہ اس دن صبح پانچ بجے اظہار حیدر صاحب العین ہلٹن ہوٹل پہنچ گئے.

انہوں نے ایک انٹرویو اردو اور ایک انگلش میں ریکارڈ کیا اور شام کو ابوظہبی اردو سروس سے نشر کیا.اور ہم نے سنا اظہار حیدر صاحب کی بیگم صاحبہ کے والد محترم کا نام پاکستان کے کرنسی نوٹوں پر لکھا ہوتا تھا مرزا ممتاز بیگ گورنر بنک دولت پاکستان. اکثر لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ مرحوم طارق عزیز صاحب نے یہ اظہار حیدر صاحب کے پروگرام کو آگے چلایا تھا.وہ اس کے موجد نہیں تھے.

❁❁❁

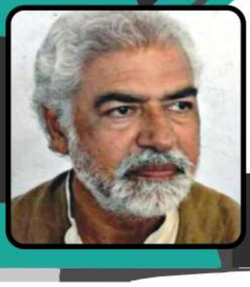

فری لانسنگ اور فراغت کے یہ دن

تحریر: ایاز امیر

جب جوانی کے ایام میں اسلام آباد کے مسلم اخبار سے ہم منسلک تھے اور اداریہ نویسی کرتے تھے، ہمارے ایڈیٹر اے ٹی چوہدری ہوا کرتے تھے۔ اپنے زمانے کے بہت مشہور صحافی تھے۔ پروقار اور رعب دار شخصیت کے مالک تھے اور ہم جیسوں کو ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ گپ شپ بھی بہت عمدہ کرتے تھے اور شام کو ان کے دفتر میں یوں سمجھیے ایک محفل جمتی۔ جاننے والے ملنے کو آتے، چائے کے دور چل رہے ہوتے، گپ شپ ہوتی اور ساتھ ہی اخبار کا کام نمٹایا جاتا۔ اس زمانے میں ہم نے صحافت میں نئے نئے قدم رکھے تھے اور ظاہر ہے وہ تجربہ نہ تھا جس کا شاید آج ہم کلیم کرسکیں۔ ایک روز کا ذکر ہے، چوہدری صاحب نے ہمیں کہا، مزہ اخبار کی نوکری میں نہیں بلکہ فری لانسنگ میں ہے۔ یعنی آپ گھر بیٹھے مضمون نویسی کر رہے ہوں، یہ صحافت کا مزہ اور معراج ہے۔ مجھے یاد ہے، میں نے دل میں سوچا، خود تو ایڈیٹر بنے ہوئے ہیں اور ہمیں گھر بیٹھنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرا اور ہم نے اخبار کی باقاعدہ نوکری ترک کر کے فری لانسنگ شروع کی تب ان کی بات سمجھ میں آئی۔ کچھ زیادہ عمر نہ تھی جب گھر میں بیٹھ کے اخبار کے لئے کالم نویسی کا کام شروع کیا۔ پھر جوں جوں اس زندگی کا لطف آیا چوہدری صاحب یاد آیا کرتے تھے۔ یہ جو گاؤں یا چکوال میں لیٹے اپنے نکمے پن کا مزہ اڑا رہے ہوتے ہیں یہ صرف فری لانسنگ کی بدولت ہے۔ اپنے ٹائم کے خود ماسٹر۔ کسی دفتر نہیں جانا، کوئی دکان کا کاروبار نہیں سنبھالنا۔ صبح اٹھے، کافی پی، اخبار بینی میں کچھ وقت گزارا، کالم لکھنا ہوا تو لکھ ڈالا۔ دن کے باقی لمحات جیسے چاہیں گزار دیں، کتاب پڑھتے ہوئے، موسیقی سنتے ہوئے یا کوئی اور دل پسند جھک مارتے ہوئے۔ یہ سب فری لانسنگ کی وجہ سے ہے۔ انسان کا مزاج ویسے بھی تھوڑا سا آوارہ ہو (یہ لفظ موزوں نہیں لیکن ذہن میں اس کا متبادل نہیں آرہا) اور دال روٹی کا وسیلہ گھر میں چل کے آجائے تو ایسے انسان کو اور کیا چاہیے۔

البتہ ایک بات کا اضافہ ناگزیر ہے۔ محض فری لانسنگ سے کام نہ چلتا اگر انٹرنیٹ ایجاد نہ ہوتا۔ جس زمانے میں ہم نے صحافت شروع کی تب صحافت کے لوازمات کسی بڑے شہر میں قیام پذیر ہو کے ہی پورے ہو سکتے تھے۔ چکوال جیسے شہر سے قومی صحافت نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ آپ اسلام آباد، لاہور یا کراچی رہیں۔ پشاور بھی صحافت کا ایک مرکز تھا لیکن ثانوی حیثیت کا۔ یہ انٹرنیٹ اور دیگر ذرائع انفارمیشن کا کمال ہے کہ آپ گاؤں میں کیا کسی پہاڑ کی چوٹی پہ ایک سادھو کی زندگی گزار رہے ہوں تو ساتھ ساتھ صحافت کے تقاضے بھی پورے کر سکتے ہوں۔ پہلے پہل ہم کالم بھیجتے تھے تو پاکستان انٹرنیشنل کی ڈاک کے سہارے۔ پی آئی اے صحافیوں کو رعایت دیتی تھی اور ڈیڑھ یا دو روپے میں ہمارا پیکٹ اسلام آباد سے لاہور یا کراچی پہنچ جاتا۔ پی آئی اے کا دفتر تب آبپارہ میں تھا۔ ہمارے لئے ضروری ہوتا کہ پیکٹ لے کر آبپارہ جاتے اور پھر دوسرے دن پیکٹ منزل مقصود پہ پہنچتا۔ ہم ٹائپ شدہ کاغذات بھیجتے تھے۔ اخبار کے دفتر میں وہ کاغذات کمپیوٹر کی لکھائی پہ چڑھتے۔ کئی غلطیاں بھی ہوتیں اور پھر جا کے کالم اخبار کی زینت بنتا۔ فون بھی کرنا پڑتا کہ کالم پہنچ گیا ہے، دوبارہ ٹائپنگ میں کوئی غلطی تو نہیں ہوئی وغیرہ وغیرہ۔ یہ جو عیاشی ہے کہ کمپیوٹر سکرین پہ کالم کی تحریر مکمل کی اور پھر بٹن دباتے ہی یہاں سے وہاں کالم پہنچ گیا، اسے تو ایک عجوبہ ہی سمجھنا چاہیے۔ ہاں، یاد پڑتا ہے کہ پیکٹ بھیجنے کے دنوں کے بعد فیکس مشین کی آمد ہوئی تھی۔ ہم جیسے آدمیوں کے لئے فیکس مشین کسی سائنسی انقلاب سے کم نہ تھی۔ میں ہمیشہ حیران ہوتا کہ کیسی مشین ہے، کاغذ ایک طرف ڈالا اور دور کسی دوسرے شہر مشین سے نکل آیا۔ انٹرنیٹ اور ای میل کا تو تصور تک نہ تھا۔ لہٰذا فری لانسنگ پلس انٹرنیٹ سے ہم جیسے فارغ انسانوں کی زندگی میں آسانیاں پیدا ہوئیں۔ اوپر سے یہ زمانہ آ گیا ہے۔ جس سست روی کو برا سمجھا جاتا تھا اسی سست روی کی اب باقاعدہ تلقین ہو رہی ہے۔ یہ جوانی اور جوانمردی کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ نوجوان گھر سے باہر نکلیں اور کچھ کام کریں۔ زمانہ کیسا آیا ہے کہ اب تلقین کی جا رہی ہے کہ گھروں پہ ہی رہو، کسی سے نہ ملو، فضول آمدورفت سے پرہیز کرو۔ اوروں پہ ایسی باتوں کا اثر کیا ہوگا ہم نہیں کہہ سکتے لیکن ہمارے جیسوں کو اور کیا چاہیے۔ گھر بیٹھے ہوں، فراغت کے مزے لے

رہے ہوں، فضول میل ملاقات سے جان چھوٹ گئی ہو۔ جی چاہا تو اپنے فون پہ ہی سپیکر لگا کر فلمیں دیکھ لیں۔ نیٹ فلیکس (Netflix) کو اگر آپ سبسکرائب کریں تو مہینے کے چودہ پندرہ سو روپے دینے پڑتے ہیں۔ آپ نے ایسا کر لیا تو چٹخارے کی فلمیں دیکھتے رہیے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے کہ اپنا وقت کیسے گزار رہے ہو کیونکہ اب تو رائج الوقت حکمت ہی یہی ہے کہ گھر پہ رہو اور لوگوں سے دور رہو۔ جو ویسے ہی خلوت پسند تھے وہ اور کیا چاہیں گے؟ نیٹ فلیکس سے یاد آیا، پورا پچھلا ہفتہ ایک سیریز دیکھتے گزر گیا جو کولمبیا کے منشیات کے سمگلروں کے بارے میں ہے۔ ایک حصہ ختم ہوتا تو دل چاہتا دوسرے پہ جائیں۔ ایسی بے شمار فلمیں ہیں جو آپ دیکھتے جائیں۔ البتہ یہ بات کہنی ضروری ہے کہ رات کے وقت ایسی فلمیں یا کوئی بھی فلم دیکھنے سے پرہیز کرنی چاہیے۔ نہیں تو نیند برباد ہو جاتی ہے اور ایسا ہو تو آنے والا دن بھاری لگتا ہے۔ خلوت کا مزہ بھی تب ہے کہ صحت برقرار رہے اور صحت بغیر اچھی نیند کے ممکن نہیں۔ اس دوران مختلف محکموں کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو گیا ہے۔ پہلے ہم محکمہ زراعت کی اہمیت کو بہت اونچا سمجھتے تھے لیکن ہر چیز کی بندش کی وجہ سے جو صورتحال پیدا ہوئی ہے اس میں محکمہ ایکسائز کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو گیا ہے۔ ہماری بڑی فضول حکومتیں ہیں۔ جو محکمے صحیح کام کے ہیں ان کی افادیت کو سرے سے جانتی نہیں۔ محکمہ ایکسائز کے صحیح اہداف مقرر کیے جائیں اور محکمے کی اصل اہمیت کو سمجھا جائے تو پنجاب کا سارا بجٹ خسارہ پورا ہو سکتا ہے۔ حالت یہ ہے کہ حکومت کی جیب میں کچھ نہیں جا رہا۔ صورتحال کا فائدہ کون اٹھا رہے ہیں؟ ایک سے ایک دو نمبریا۔ ہر ملک میں محکمہ ایکسائز کے کارن حکومتیں فائدہ اٹھاتی ہیں، یہاں پہ کام الٹا ہے۔ اور سمجھنے والا کوئی نہیں۔ استدعا صرف اتنی ہے کہ جائز حدود میں رہ کر محکمہ ایکسائز کو کام کرنے دیا جائے۔ آخر حکومتوں کا محکمہ ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی کا نہیں۔ لیکن بیکار کی باتیں ہیں، کسی نے کیا سننا ہے۔ بات تو مارکیٹ کی ہوتی ہے یا جسے معاشی ماہرین سپلائی اینڈ ڈیمانڈ کہتے ہیں۔ پچھلے ہفتے شام گاؤں بیٹھا تھا کہ یک دم احساس ہوا، مارکیٹ کی پوزیشن خراب ہو رہی ہے۔ فوراً ہی فون جا کھڑکایا۔ ایک جاننے والے ہیں محکمے میں، بھلا ہو ان کا، گاؤں آئے اور ہماری تسلی ہو گئی۔ جس کیفیت کا ڈر تھا وہ ٹل گئی۔ سوال یہ ہے کہ ہم ایک نارمل ملک بننے سے کیوں اتنے انکاری ہیں؟ ہمیں یہ کیا شوق ہے کہ ہم نے اپنا انداز نرالا ہی رکھنا ہے؟

حالت دیکھیں، انٹرنیٹ آ گیا، نیٹ فلیکس پہ ہم نے دنیا جہان کی فلمیں دیکھ لیں، لیکن مارکیٹ کا مسئلہ اٹھے تو ایکسائز کے کسی دوست کو فون کرنا پڑتا ہے۔ ہم نے جو زندگی گزارنی ہے اس کا بیشتر حصہ گزار چکے۔ او کھے سو کھے ہم نے اپنا کام چلا لیا لیکن مختلف پہلوؤں سے جو حالات اس ملک کے ہیں اور جو حالات بنا دیے گئے ہیں ایسا ہونا تو نہیں چاہیے۔ لوگوں کی زندگیوں کو اتنا مشکل نہ بنایا جائے۔ آسانیاں پیدا کی جائیں۔ ہنستا کھیلتا ملک ہوا کرتا تھا۔ منافقت کا لبادہ جو اب پاکستانی معاشرے نے اوڑھ رکھا ہے ایسا ہمیشہ نہ تھا۔ لیکن جو چہرے مسند اقتدار کے اردگرد ہیں ان سے کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ بشکریہ دنیا۔

❁❁❁

ضروری اعلان

ادارہ کے مالی حالات کے پیش نظر اور اس کو جاری رکھنے اور مزید بہتر ترقی دینے کی خاطر "ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل" اور خواتین ڈائجسٹ "آبگینے" ہلا ہور رسالہ ہر دو زبانوں اردو اور انگریزی میں لندن سے شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں رسالوں کو ادارہ اپنی ذاتی مالی حیثیت کے مطابق کئی سالوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے تمام قارئین کے لئے یہ ایک معیاری اور پسندیدہ رسالے ہیں۔ ان کا خاص مقصد معاشرہ کی بہتر اصلاح، سچی کھری صحافت اور اسلام کی ترقی کے لئے یہ ایک تبلیغی کوشش ہے۔ یاد رہے ایسے اخبارات و رسائل کو جاری رکھنے کے لئے ایک بڑا ادارہ یا بزنس مین یا اشتہارات کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں میسر نہیں۔

آپ تمام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کی ماہانہ مالی مدد فرما کر اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ آپکی یہ معمولی رقم ہماری ہمت افزائی اور ترقی کا باعث ہو گی۔ آپ اپنی رقم درج ذیل بنک میں جمع کروا سکتے ہیں۔ اللہ تعالی آپ کا حامی و ناصر ہو۔

Bank Name:
Lloyds Bank PLC
Account Name:
Lahore International LTD
Account No:
42534160
Sort Code:
30-96-26
IBAN: GB89Loyd
3096242534160

❁❁❁

چودھریوں کا چھپا دشمن؟

تحریر: سہیل وڑائچ

سیاست ہو یا وبا، ہم پنگے لینے سے باز نہیں آتے۔ کورونا کی وبا اچھی خاصی قابو میں تھی مگر ہم نے عید کے دنوں میں پنگا لے کر لاک ڈاؤن کھولنے کا تجربہ کر لیا، اب یہ بے قابو ہے۔ مجھے کرونا کا شکار ہوئے آٹھ دن ہو گئے بخار چڑھتا رہا، اُترتا رہا۔ اب کورونا علامات کم ہو رہی ہیں۔ گھر میں قرنطینہ میں ہوں اور پہلے سے بہتر ہو رہا ہوں۔ دوسری طرف حکومت نے کونے میں بیٹھے دہی کلچہ کھاتے شہباز شریف سے خواہ مخواہ پنگا لے لیا۔ اور یوں ظاہر کر دیا کہ شہباز شریف یکتا و تنہا نہیں ہے، وہ لیڈر آف دی اپوزیشن ہے اور اس سے پنگا لیں گے تو اس کے بہت سے چھپے اور ظاہری دوست سامنے آ جائیں گے۔ یہی حال چودھری خاندان کا ہے، وہ مخلوط حکومت میں خاموشی سے وقت گزار رہے ہیں۔ کبھی ان کے خلاف نیب انکوائری کھلنے کی خبر ملتی ہے تو کبھی شوگر انکوائری میں ان کا نام آ جاتا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ نیب کی وجہ سے مونس الٰہی وزیر نہیں بن سکتا جبکہ نیب کے دوسرے ملزموں کو گھر سے بلا کر وزارت دے دی جاتی ہے۔ یہ سب پنگے ہیں اور جو بھی پنگے کرتا ہے اسے سیاست میں یہ پنگے مہنگے پڑتے ہیں۔ گزشتہ دنوں چودھری پرویز الٰہی سے تفصیلی انٹرویو کا موقع ملا۔ چودھری خاندان کی سیاست سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر ان کی سیاست میں اہمیت سے انکار ممکن نہیں، وہ عملیت پسندی کی سیاست کرتے ہیں، اپنے اہداف کا خیال رکھتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ وہ پنجاب کی روایتی وضعداری، کھلے پن اور مہمان نوازی کی علامت ہیں۔ سیاست کے ٹھہرے پانیوں میں جب بھی حرکت ہوگی اُس میں لازماً چودھری خاندان کا حصہ ہوگا۔ اسپیکر پنجاب اسمبلی چودھری پرویز الٰہی کو سیاست کے ماہ و سال نے کندن بنا دیا ہے۔ کبھی ان میں بغاوت اور جارحیت ہوتی تھی مگر اب تدبر اور حوصلہ مندی نمایاں ہو چکی ہے۔ میں نے پوچھا کہ آخر ان کا چھپا دشمن کون ہے، جو کبھی نیب اور کبھی شوگر اسکینڈل کے ذریعے آپ پر وار کرتا ہے؟ چودھری پرویز الٰہی ہلکا ہلکا مسکراتے رہے اور میرے سوالوں کو ٹالتے رہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا وہ بیوروکریٹ ہے یا کوئی ادارہ ہے؟ ہنس کے جواب دیا نہیں۔ انہیں علم ہے کہ وہ کون ہے مگر ابھی بتائیں گے نہیں اور پھر قہقہہ لگا کر معنی خیز انداز میں کہا ''وہ عمران خان نہیں ہے''۔ میری آنکھیں ان سے چار ہوئیں، ان کی آنکھوں میں شرارت کی شوخی دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ابھی وہ اپنے چھپے دشمن کا نام لینا نہیں چاہتے مگر وہ اسے ڈھونڈ چکے ہیں۔ میں چودھری پرویز الٰہی سے یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ وہ ڈپٹی وزیراعظم اور وزیراعلیٰ رہنے کے بعد آخر پنجاب اسمبلی کے اسپیکر کیوں بنے؟ انہوں نے صاف جواب دیا کہ یہ فیصلہ وزیراعظم عمران کا تھا۔ انہوں نے عمران خان کو اختیار دیا تھا کہ جو وہ کہیں گے ہم بطور اتحادی ویسا ہی کریں گے۔ میں نے شرارتاً کہا کہ نہیں، پنجاب میں تو آپ اس لئے ہیں کہ آپ کی وزارتِ اعلیٰ پر نظر ہے، اسی لئے اسپیکر شپ قبول کر لی۔ چودھری پرویز الٰہی نے سنجیدگی سے کہا اسپیکر شپ تو وزیراعظم کے کہنے پر قبول کی

اور پھر ہنس کر مجھے رزاق داؤد کے والد سیٹھ داؤد کا واقعہ سنایا کہ جونیجو حکومت ختم ہوئی تو چودھری شجاعت کو سیٹھ داؤد ملے اور پوچھا کیا کر رہے ہو، انہوں نے کہا ابھی حکومت ختم ہوئی ہے تو سیٹھ داؤد نے کہا ''مارکیٹ میں رہو گے تو دام پڑے گا''، چودھری پرویز الٰہی نے قہقہہ لگا کر کہا گویا ''ہم مارکیٹ میں تو ہیں''۔

پنجاب میں تبدیلی کی افواہیں آتی رہتی ہیں۔ شہباز شریف نے اِس کالم نگار کو بتایا تھا کہ چودھری خاندان سے ان کے اختلافات ختم ہو چکے ہیں، یہی معاملہ میں نے براہِ راست چودھری پرویز الٰہی سے پوچھا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا ''شہباز صاحب کو آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی بہت اچھی طرح جانتا ہوں'' پھر مجھے کہا کہ کس طرح وزیر آباد کا دل اسپتال، پنجاب اسمبلی کی نئی بلڈنگ اور سیالکوٹ موٹروے میں تاخیر کی گئی۔ مونس پر مقدمات بنائے گئے۔ گفتگو کا ماحصل یہی تھا کہ حالات کچھ بھی ہو سکتے ہیں مگر تاحال چودھریوں اور شریفوں میں پنجاب کی تبدیلی کے حوالے سے کوئی ثمر آور بات نہیں ہوئی، ابھی دھند باقی ہے اور یہ جلدی چھٹنے والی نہیں ہے۔ یہ بات طے ہے کہ اس بار راستہ شریف دیں گے تبھی یہ معاملہ آگے چلے گا۔ مولانا فضل الرحمٰن کے دھرنے کے پیچھے چودھری تھے؟ کیا واقعی ترین اور چودھری مل کر پنجاب میں کوئی تبدیلی لانا چاہتے تھے؟ سازشوں، غلط فہمیوں اور قیاس آرائیوں کے حوالے سے میں نے سوال پوچھا تو چودھری پرویز الٰہی نے کہا کہ ہم نے کبھی کسی اتحادی کے خلاف سازش نہیں کی ہے۔ پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر پانچ سال پورے کیے، کبھی سازش نہیں کی، ساتھ کھڑے رہے۔ مولانا فضل الرحمٰن سے مذاکرات حکومت کے کہنے پر کیے۔ جہانگیر ترین تو تحریک انصاف کی طرف سے ہمارے لوگ توڑتے رہے تھے ہاں جب انہیں اپنی ہمشیرہ کے لئے سینیٹ کے ووٹوں کی ضرورت پڑی تو تب وہ مدد کے لئے آئے تھے اور ہم نے مدد کی بھی۔ علیم خان مشکل کے دنوں میں آئے تھے، ان سے بھی تعاون کیا۔ ہم اپنی اتحادی حکومت کے خلاف سازش نہیں کریں گے، اِسے چلائیں گے اور اگر کوئی سازش ہوتی تو اب تک سامنے آ چکی ہوتی۔ چودھری پرویز الٰہی کے مطابق چودھری شجاعت حسین ڈاکٹروں کی ہدایت کے پیش نظر چناب کنارے نت گاؤں میں مونس الٰہی کے بنائے گئے فارم ہاؤس میں ہیں تاکہ کورونا سے محفوظ رہیں تاہم وہ گاہے گاہے فون کر کے یہ کہتے ہیں کہ حکومت کو خود سے کوئی مشورہ نہ دے دینا۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ حکومت کو مشورے نہیں دیتے؟ چودھری پرویز الٰہی نے کہا کہ سال بھر سے تو اتحادی رہنما سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی اور مشورہ اسے دیا جاتا ہے جو اس پر عمل کرے جو مشورہ سن کر اس پر شک کرے اسے مشورہ کیا دینا۔ چودھری پرویز الٰہی کو اِدھر اُدھر سے بہت کریدا مگر انہوں نے صاف کہہ دیا ہم حکومت گرانے والوں میں نہیں ہوں گے۔ چودھری پرویز الٰہی سے سیر حاصل گفتگو کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حکومت کے خلاف نہ کوئی سازش ہو رہی ہے نہ کوئی اسے نکالنا ہی چاہتا ہے۔ البتہ اس حکومت کے اپنے پنگے بہت ہیں اگر حکومت کو کوئی خطرہ ہے تو وہ اپنے ہی پنگوں سے ہے۔ ایک طرف حالات یہ ہیں کہ پورے ملک کا ترقیاتی بجٹ بند کر دیا ہے۔ زراعت، سڑکوں کی تعمیر و مرمت اور لائیو اسٹاک تک کے بجٹ واپس لے لئے گئے ہیں جبکہ میانوالی اور راجن پور کے ترقیاتی کام اسی طرح جاری و ساری ہیں۔ 82 ارب روپے کے پروجیکٹس تو صرف ضلع میانوالی کیلئے مختص ہیں، اتنی رقم سے تو سونے کی سڑکیں اور چاندی کی نہریں بن جانی چاہئیں مگر میانوالی میں ابھی تک ایسے بڑے ترقیاتی منصوبے کی چاپ تک سنائی نہیں دیتی۔ کہتے ہیں ''ڈنمارک ریاست میں کہیں نہ کہیں خرابی ہے'' کے مصداق موجودہ حکومت کو از سر نو اپنا جائزہ لینا چاہئے۔ یہ بات طے ہے کہ جس طرح معاملات چل رہے ہیں ایسے نہیں چل سکتے۔ اپوزیشن کے ساتھ یہ رویہ، معاشی بدحالی اور اوپر سے بیڈ گورننس، یہ سب چلنے کے انداز نہیں ہیں۔ توقع یہی کرنی چاہئے کہ شہباز شریف کو کی گئی کال ریاست اور حکومت کے رویے میں نئی تبدیلی کا مظہر ثابت ہوگی اور پاکستان میں حکومت اور اپوزیشن مل کر ملک کو بحران سے نکالنے کی کوشش کریں گے۔

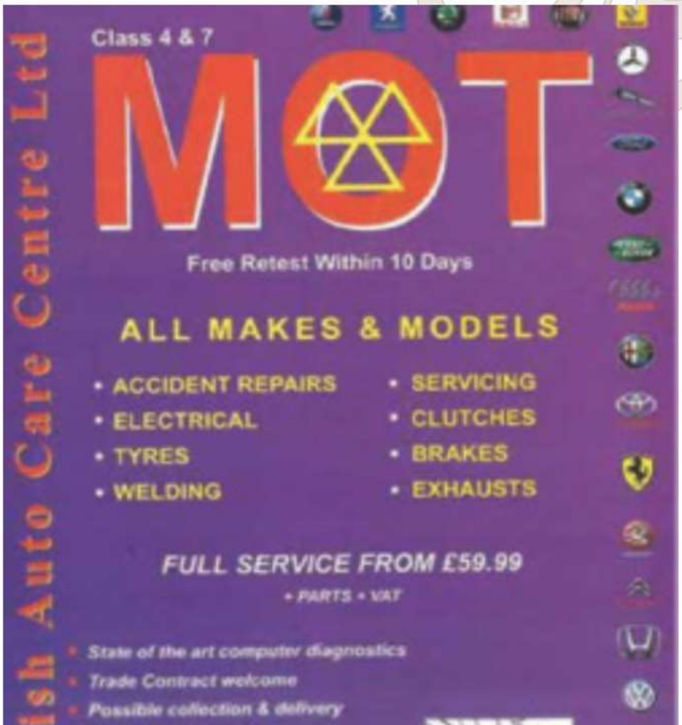

شعبہ پاکستان

لاہور کی مسجد شب بھر

(مسجد شہید)

تحریر: طلحہ شفیق

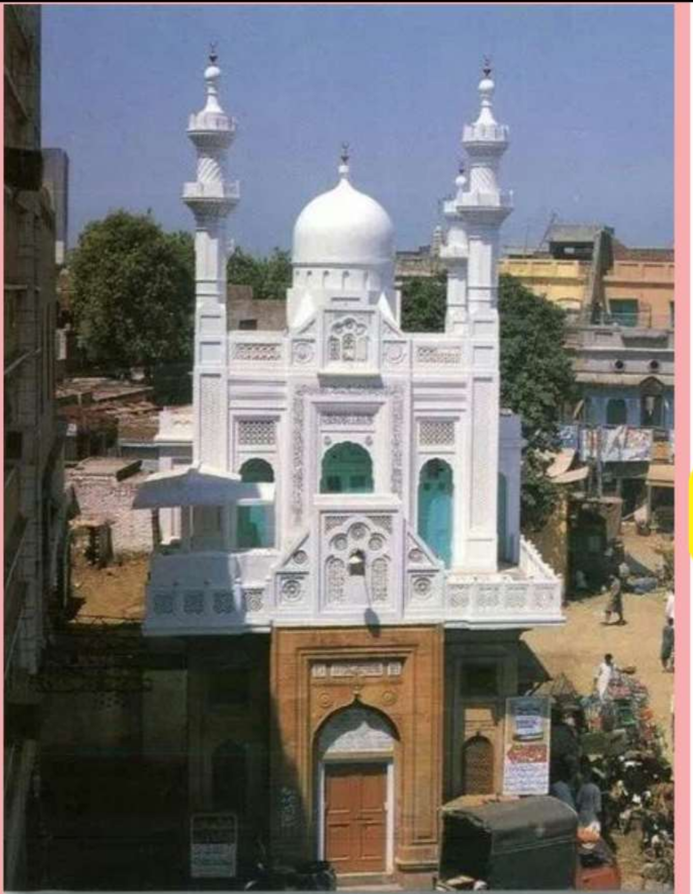

لاہور کی یہ مشہور و معروف مسجد شاہ عالمی چوک میں واقع ہے۔

اس مسجد کی وجہ شہرت اس کی تعمیر کے ساتھ جڑا ایک دلچسپ قصہ ہے، جس میں اہالیان لاہور نے مصالحے کچھ تیز ہی رکھے ہیں۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ جس جگہ مسجد ہے، اس زمین کے مدعی ہندو بھی تھے اور مسلم بھی۔ مسلمانوں نے یہاں ایک تھڑا بنا رکھا تھا جس پر وہ نماز ادا کرتے، آہستہ آہستہ یہاں اذان بھی شروع ہوگئی۔ یہ دیکھ کر ہندو بپھر گے اور اس جگہ کا تقاضا شروع کر دیا کہ وہ یہاں بھگوان کا گھر بنائیں گے۔ اس بات پر دونوں کے درمیاں تصادم ہوا اور معاملہ جا پہنچا انگریز منصف کے پاس۔ مسلمانوں کے وکیل جن کا نام بیشتر نے قائد اعظم محمد علی جناح بتلایا ہے، یہ سب جان مسلمانان ہند کو مشورہ دیا کہ بھائیو جب صاحب بہادر یہاں قدم رنجہ فرمائیں تو اگر تو اس جگہ مسجد کے آثار ہوئے تو رسم اذاں قائم رہے گی ورنہ مندر کی گھنٹی بجے گی۔ کیونکہ انگریز کے قانون میں سبھی مذاہب کی عبادت گاہیں محترم ہیں یعنی منہدم کرنے کی اجازت کسی کو نہیں۔ یہ سن کر فرزندان توحید معرکہ حق و باطل کے لیے تیار ہو گئے، ریل کے اسٹیشن تا شاہ عالمی اور شاہ عالمی تا باغبان پورہ اینٹیں قطار کی صورت ہاتھوں ہاتھ ترسیل کی گئیں۔ استاد گاما پہلوان نے ان سب کا پہرہ دیا۔ یوں یہاں رام رام ست ہے کی بجائے، اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔ اس ایمان افروز واقعے کا سن زیادہ تر نے 1917 جبکہ بعض نے 1922 درج کیا ہے۔ کچھ نے حضرت اقبال کو بھی معماران مسجد میں شمار کیا ہے جبکہ دیگر کا کہنا ہے علامہ صاحب کو جب تیسرے روز اطلاع ملی تو وہ بھی جذبہ ایمانی کی داد دیے بنا نہ رہ سکے اور اپنا درج ذیل شہرۂ آفاق شعر کہا:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

درج بالا کتھا تو اس روایت پر مبنی ہے جو سینہ بہ سینہ چلتی آ رہی ہے اور زباں زد عام ہے۔ یعنی ہر ایک نے زیب داستاں کے لیے حسب ضرورت اس میں اضافہ کیا ہے۔ اصل معاملہ تھوڑا مختلف ہے۔ نقوش لاہور نمبر میں اس مسجد کی تعمیر کا احوال یوں درج ہے "ابتدا میں یہاں ایک کچا سا چبوترہ تھا جس پر لوگ نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس کے قریب ہی ہندوؤں کا ایک مندر تعمیر ہوا۔ مسلمانوں کو مسجد پختہ کرنے کا خیال آیا تو حکومت نے ہندو مسلم فساد کے پیش نظر اس کی اجازت نہ دی۔ مئی 1922 میں ایک روز پر جوش نوجوانوں نے آپس میں مشورہ کر کے رات رات میں یہاں مسجد کھڑی کر دی۔ وہ عشا کی نماز کے بعد کام پر لگے اور فجر کی نماز کے بعد فارغ ہو گئے۔ چونکہ مسجد میونسپل کمیٹی کی اجازت کے بغیر زبردستی کھڑی کی گئی تھی۔ اس لیے حکومت نے پولیس کی مدد سے زبردستی گرا دی۔ 1353 ہجری میں اس جگہ منظوری کے ساتھ مسلمانوں کے چندے سے انجمن اسلامیہ نے یہ عمارت تعمیر کی جو آج بھی موجود ہے۔" اس وقوعہ کی مزید وضاحت مولانا غلام رسول مہر کے اس بیان سے ہو جاتی ہے "لاہور کے مسلمانوں نے اچانک جمع ہو کر ایک رات میں شاہ عالمی دروازہ کے باہر مسجد بنا کر کھڑی کر دی۔ اس مسجد کے لیے مدت سے درخواست دے رکھی تھی اور وہ درخواست منظور نہ ہوتی تھی۔ انہوں نے چپکے چپکے سارا مسالہ فراہم کر لیا۔ شام کے بعد بنانے لگے اور صبح سے پہلے پہلے مسجد مکمل کر لی۔ کچھ مدت بعد

حکومت نے فوج کھڑی کر کے اس مسجد کو گرا دیا۔ پھر باقاعدہ منظوری حاصل کر کے یہ از سرِ نو تعمیر ہوئی۔" مولانا صاحب چونکہ اخبار نویس بھی تھے اس لیے ان کا بیان قابل توجہ ہے۔

منیر احمد منیر کی کتاب "مٹتا ہوا لاہور" میں حافظ معراج دین صاحب کا ایک انٹرویو شامل ہے، جس میں انہوں نے اس واقعہ کا یوں تذکرہ کیا ہے" وہ مسجد ہے نا، مسجد تو بنادی شب بھر میں۔ یہ میرے باپ کی سجدہ گاہ ہے۔ پچھلی طرف میوہ منڈی تھی، اس کے اوپر لمبی چھت ہوتی تھی۔ نیچے دکانیں ہوتی تھیں۔ ان میں میرا دادا کرائے دار تھا۔ دکانیں تھیں چھوٹی، ایک منزلہ۔ ایک ملا صدرالدین تھا۔ ساتھ والی دکان اس کی تھی۔ مولوی صدرالدین نمازی پرہیز گار آدمی تھا۔ میرے والد صاحب بھی۔ انہوں نے کہا کہ یہاں تھڑا سا بنا دیں۔ تھڑا بنایا تو اس پر کتے پھریں، پیشاب کریں۔ پھر اینٹیں لگانی شروع کر دیں۔ کسی مخیر آدمی نے نلکا لگوا دیا۔ اس طرح مسجد بن گئی۔ اس کے ساتھ ہندوؤں نے مندر بنانا شروع کر دیا۔ ایک رات فوج نے آ کے قبضہ کر لیا۔ ایک میاں خیر دین ہوتا تھا ہمارے ساتھ مسلم لیگ میں اس نے حصہ لیا۔ ایک ساجی ہوتا تھا اس نے حصہ لیا۔ بڑا کچھ ہوا۔"

مسجد شب بھر کی تعمیر کا ذکر پروفیسر مسعود الحسن و ڈاکٹر ایس ایم ناز نے بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تو معروف روایت ہی درج کی ہے جبکہ پروفیسر صاحب کا بیان مولانا مہر سے ملتا جلتا ہے۔ اب اصل معاملہ کچھ اس طرح ہے کہ یہاں ایک چبوترہ ہوتا تھا جہاں دکاندار یا مسافر حضرات نماز ادا کر لیا کرتے تھے۔ ہندوؤں نے جب قریب ہی مندر کی تعمیر شروع کی تو مسلمان حساس ہو گئے۔ نیز دونوں کے درمیان کچھ بحث و تکرار بھی ہوئی۔ اس کے ردِعمل میں چند نوجوانوں نے رات بھر میں یہاں باقاعدہ ایک مسجد کا ڈھانچہ بنا دیا۔ چونکہ یہ بلدیہ کی منظوری کے بغیر بنا تھا اس لیے اس کو منہدم کر دیا گیا۔ بعد ازاں انجمن اسلامیہ پنجاب نے اسی مقام پر ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کر دی۔ اب یہ جج صاحب کی آمد، قائد کی تجویز اور گاما پہلوان کی نگہبانی اضافی چیزیں ہیں۔ نیز یہ بھی درست نہیں ہے کہ فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا اور موجودہ مسجد کی عمارت وہی ہے جو رات بھر میں تعمیر ہوئی۔ اس مسجد کے متعلق عوام میں بہت سے قصے مشہور ہیں۔ یہاں موجود امام صاحب بھی غلط فہمیوں کی ترویج و ترقی کا باعث ہیں۔ پاکستان ٹوڈے میں تانیا قریشی صاحبہ کا اور روزنامہ دنیا میں بھی ایک مضمون دیکھا۔

دونوں نے ہی ذرا سی جستجو تک کرنے کی زحمت نہیں کی اور بس زبان زد خلائق افسانہ لکھ دیا۔ اس مسجد کے متعلق میں نے کوئی دو درجن سے زائد ویڈیو بھی دیکھیں، سبھی کا کہنا تھا یہ کہ یہ عمارت 1917 میں بنی۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ انہوں نے مسجد کی بھرپور عکاسی بھی کی لیکن انہیں مسجد پر درج سن تعمیر نظر نہ آیا۔ مسجد پر واضح درج ہے کہ" مسجد شہید تعمیر کردہ انجمن اسلامیہ پنجاب رمضان المبارک 1353 ہجری (1934) میر عمارت منشی چغتائی۔" اس مسجد کا نام بھی مسجد شہید ہے۔ علامہ اقبال کے شعر کے باعث اس کو مسجد شب بھر یا مسجد یک شب بھی کہا جاتا ہے۔ اس شعر کے متعلق بھی شارحین اقبال کی مختلف آرا ہیں۔ یعنی اختلاف ہے کہ اس شعر میں طنز کیا گیا ہے یا خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ ویسے یہ شعر بانگ درا کے آخر میں ظریفانہ کے عنوان تحت درج اشعار میں شامل ہے۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے طنز کیا ہے کہ مسجد تو رات بھر میں بنا لی لیکن نمازی کب بنو گے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے تو اس شعر کی شرح میں بتایا ہے کہ ہند بھر میں کئی مساجد ہیں جو ایک رات میں تعمیر ہوئیں بطور مثال انہوں نے بجنور کی نگینہ مسجد کا ذکر کیا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس مسجد کے بنانے کا قصہ وہی ہے جو لاہور میں واقع اس مسجد کے متعلق عوام میں مشہور ہے۔ پشاور کی ایک مسجد کے متعلق بھی دعوی کیا جاتا ہے کہ وہ ایک روز میں تعمیر ہوئی تھی۔ بہرکیف یہ مسجد اپنے ساتھ جڑی کہانی کے باعث عوام میں بے حد مقبول ہے۔ لوگ دور دور سے اسے دیکھنے آتے ہیں۔ ویسے مسجد ہے تو مختصر لیکن تعمیراتی لحاظ سے حسن و خوبی سے خالی نہیں۔ مہتمم عمارت نے سرخ و سفید پتھر استعمال کر کے مسجد کو قابل توجہ بنا دیا ہے۔ جب مسجد تعمیر ہونا تھی تب بھی یہاں دکانیں تھیں۔ اس لیے ان کو شاید مسجد کے مستقل بندوبست و انتظام کے لیے قائم رکھا گیا۔ احباب سے گزارش ہے کہ اندرون لاہور کبھی جانا ہو تو اس چھوٹی مسجد کی زیارت ضرور کریں۔ مسجد غالباً محکمہ اوقاف کے زیر انتظام ہے تو ان سے التجا ہے کہ یہاں کم از کم ایک معلوماتی تختی ہی لگا دیں۔ تاکہ یہاں آنے والے اس کی درست تاریخ کو جان سکیں۔ انہی کوتاہیوں کی وجہ سے غلط و غیر مصدقہ روایات رواج پا جاتی ہیں اور پھر تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ عوام کو صحیح تاریخ سے واقف کروانے کا اہتمام کرے۔

❀❀❀

شعبہ پاکستان

شیعہ مراجع کی تاریخ، مذہبی حیثیت اور سیاسی اثر ورسوخ

لاہور کے اُردو بازار میں یوں تو بیشتر دوکانیں مدارس اہل سُنت کی کُتب نصاب، تفاسیر، قرآن اور شروحِ حدیث کی خرید وفروخت کا مرکز ہیں مگر چند ایک دکانیں ایسی بھی ہیں جہاں شیعہ فقہ، تاریخ اور تفسیر وحدیث سے متعلق کتب بھی دستیاب ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر وہ اُردو تراجم ہیں جو 1980 کی دہائی کے بعد پاکستان میں قائم ہونے والے شیعہ مدارس اور تحقیقاتی مراکز سے منسلک علماء نے کیے ہیں۔ ان علما کی غالب اکثریت ایرانی شہر قُم سے فارغ التحصیل ہے۔ اگر آپ شیعہ کُتب کے تاجر سے توضیح المسائل، جو روزمرّہ کے معاملات، کاروبار، نجاست و پاکیزگی کے مسائل کے حوالے سے فقہی آرأ کا مجموعہ کہلاتی ہے، طلب کریں گے تو ہوسکتا ہے کہ دکاندار آپ سے دو سوالات پوچھے: آپ کِس کی تقلید میں ہیں۔ یعنی فقہی معاملات میں کِس مجتہد کے پیروکار ہیں۔ کتابی تعریف کے مطابق ہر اثناعشری شیعہ

کا کِسی زندہ مجتہد کی تقلید کرنا واجب ہے۔ (اگرچہ کچھ ترامیم اور اضافے کے ساتھ اُس مجتہد کی تقلید بھی جاری رکھی جاسکتی ہے جو وفات پا چکا ہو)۔ اگر آپ کِسی کے مقلد ہیں جیسے کہ آیت اللہ سیستانی تو دکان دار آپ کو ان کی توضیح المسائل ہاتھ میں تھما دے گا اور اگر آپ کِسی کی تقلید میں نہیں تو دکان دار اگلا سوال پوچھے گا کہ آیا آپ کو کِسی کٹر مجتہد کی فقہی آرأ درکار ہیں یا معتدل کی! اگر جواب کٹر مجتہد ہے تو پھر آپ کو ایران کے آیت اللہ خمینی یا آیت اللہ خامنہ ای کی توضیح المسائل دی جائے گی۔ آج کے دور میں دنیا میں درجنوں شیعہ مراجع موجود ہیں جن میں ایران میں آیت اللہ خامنہ ای اور عراق میں آیت اللہ سیستانی کے نام اہل تشیع کے علاوہ دیگر فرقوں کے لیے بھی جانے پہچانے ہیں لیکن نام جاننے کے باوجود ایک بڑی تعداد کے ذہن میں یہ سوال ضرور گردش کرتا ہے کہ مرجع کا مطلب کیا ہے اور اس مقام پر فائز شخصیت کن اختیارات کی حامل ہوتی ہے۔

مرجع کون اور تقلید کیوں؟

مرجع یا مرجع تقلید دینی کے معنی ہیں وہ ذریعہ جس سے یا اس کے ذریعے دینی معاملات میں رجوع کیا جائے یا رہنمائی لی جائے۔ عمومی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اہلِ سُنّت کے چار فرقوں شافعی، حنبلی، مالکی اور حنفی کے وجود میں آنے کے بعد چوتھی صدی ہجری میں اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا تھا اور محض تقلید کی گنجائش باقی رہ گئی تھی۔ بہت سے محققین نے اس تاثر کی نفی کی ہے۔ جدید فقہی مسائل کی بابت علما سے رائے یا فتوٰی حاصل کرنا ایک عام عمل ہے جس کے لیے مدارس میں دارالفتا قائم ہیں۔ فتوٰی دینے کی اہلیت کون رکھتا ہے، اس کا انحصار عالم کی قابلیت اور رتبے پر ہوتا ہے، اسی بنیاد پر فتوٰی کی پذیرائی اور عام قبولیت کا انحصار ہوتا ہے۔ ہاں البتہ فتوٰی دینے والا اپنے مسلکی حدود اور اس کی عِلمی روایت میں رہ کر ہی کِسی نئے مسئلے کے حل کے لیے رائے قائم کرتا ہے۔ اس اعتبار سے سُنّی اور شیعہ فرقوں میں ویسا فرق موجود نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ شیعہ مذہبی فکر میں عالم یا مجتہد کے مدارج نسبتاً غیر مُبہم ہیں اور پچھلے کم از کم 200 سال میں یہ مزید مُستحکم اور مربوط ہوئے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ شیعہ مذہب اور عقیدے کی مخصوص تاریخ بھی ہے جس کے مطابق فرقہ اثناعشری کے 12 ویں امام پردۂ غیب میں ہیں اور اس عرصہ میں مذہبی امور میں اُمت کو رہنمائی مہیا کرنے کی ذمہ داری شیعہ علما پر عائد ہوتی ہے یوں علما کو نائبِ امام کا درجہ حاصل ہے۔ شیعہ مذہبی مباحث میں اُصولی اور اخباری مکاتبِ فِکر کی بحث پوری شِدّت سے 18 ویں صدی تک جاری رہی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اخباری گروہ کے مطابق علما کا مقصد خبر کی روایت کرنا ہے جو کہ اماموں اور معصومین کے

اقوال، احادیث اور فکر سے ثابت ہوں۔ ایسا رجحان قطعی طور پر خود علما کے کردار کو محدود کر دیتا ہے۔ دوسری طرف اُصولی یہ مؤقف رکھتے تھے کہ فقہ جعفریہ میں رہتے ہوئے اور فقہی اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے، مجتہدین کا یہ کام ہے کہ وہ مومنین کو اسلامی عقیدے اور احکامات کے بارے میں درست رہنمائی فراہم کریں۔ علما کے اختیارات میں توسیع کے عمل سے ہی یہ ممکن ہوا کہ 19ویں صدی کے اواخر تک مجتہد کا عہدہ یا مرجع کا منصب دھیرے دھیرے اہمیت اختیار کرتے گئے۔ اس عمل میں بہت سے دیگر عوامل بھی شامل تھے۔ مثال کے طور پر محقق عباس امانت کا یہ استدلال ہے کہ بابی اور پھر بہائی مذہب کی تحریکوں نے علما کو اپنی ترجیحات بدلنے پر مجبور کیا۔ بابی اور بہائی تحریروں میں علما کا نائبین امام ہونے کا منصب چیلنج کیا گیا اور یہ دعویٰ کیا گیا کہ اسلامی تاریخ کا دائرہ اس نقطے پر آ چکا ہے جہاں سے نئی مذہبی، الہامی فکر اور احکامات کا باب کُھل گیا ہے۔

علما نے قاچار ریاست کی مدد سے اِن تحریکوں کو کُچلنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اس اثنا میں دیگر سیاسی اور فکری تبدیلیاں جیسا کہ مغربی علوم وفنون کا غلبہ اور مسلم مملکتوں کا سیاسی زوال، علما کے عمومی رویّوں میں تبدیلی کا باعث بنا۔ سنہ 1850 کی دہائی میں شیخ مرتضیٰ انصاری کو پہلی مرتبہ مرجع کا درجہ حاصل ہوا جو عثمانی سلطنت کے دور میں نجف میں مقیم رہے۔ انھیں سیّد محمد حسن نجفی نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ نجفی نے اپنی زندگی میں ہی اپنے نمائندے دنیا میں پھیلے شیعہ مسلمانوں کی طرف بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا تھا جو وہاں سے خمس اکٹھا کرتے تھے۔ (خمس آمدن کا پانچواں حصہ ہے جو زکوٰۃ کے علاوہ ہے اور شیعہ فقہ کے مطابق اس کا ایک حصہ صرف سادات پر خرچ کیا جا سکتا ہے)۔ یوں ایک ایسے سلسلے کی ابتدا ہوئی جس میں مالی وسائل اور مذہبی طاقت میسر تھی جس کا بہترین استعمال شیخ انصاری نے کیا اور مجتہد کی طاقت اور مرجع کے رتبے میں اضافہ ہوا۔

مرجع کا درجہ کیسے ملتا ہے

مرجع کا درجہ حاصل کرنے کے لیے کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ صرف مجتہد کا درجہ پانے کے لیے کئی دہائیوں پر مبنی علمی ریاضت درکار ہے۔ اس کو صرف چند سال کے نصاب تک محدود نہیں سمجھنا چاہیے کہ جس کے بعد افتا یعنی فتویٰ صادر کرنے کی سند مِل جاتی ہے۔ یہ عمل طویل ہے۔ محقق ومصنف شبلی ملّاطِ کی تحقیق کے مطابق شیعہ مجتہد بننے کے لیے تین حلقے یا مدارج ہیں۔ عموماً پہلے دو حلقوں کی تکمیل میں دس برس صرَف ہوتے ہیں۔ پہلا حلقہ مقدمات کہلاتا ہے جس میں طالبِ علم صرف ونحو اور منطق کے اصول پڑھتا ہے۔ دوسرا حلقہ سُطُوح کا کہلاتا ہے جس میں استدلالی فقہ اور اصولِ فقہ زیرِ مطالعہ آتے ہیں۔ اس کے علاوہ علم الکلام، تفسیر، حدیث، فلسفہ اور اسلامی قانون بھی پڑھایا جاتا ہے۔

کچھ کُتب مشترک ہیں لیکن مقامی اثرات کی وجہ سے اور مرجع کے زیرِ اثر چلنے والے مدارس کُتب کے انتخاب میں کچھ فرق بھی رکھتے ہیں۔ تیسرا اور آخری حلقہ درس الخارج کہلاتا ہے۔ اس حلقے میں طالبِ علم نامور مجتہدین کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتا ہے۔ اُن کے دُروس میں شریک ہوتا ہے جن میں مختلف موضوعات پر تدریس کا سِلسِلہ بعض اوقات کئی ماہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس حلقے میں باقاعدہ امتحانات منعقد نہیں ہوتے اور نہ ہی وقت کی کوئی قید ہے۔ البتہ طالبِ علم کو اس بنیاد پر پرکھا جاتا ہے کہ اس نے کِسی موضوع پر رسالہ تحریر کرنے میں کِس درجہ علمی قابلیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ کیا وہ محض نقلی علوم یعنی پہلے سے معلوم آرا اور روایات نقل کرنے تک محدود رہا ہے یا اتنی استعداد پیدا کر پایا ہے کہ نقد ونظر سے کام لے سکے۔ یوں اس حلقے کا دورانیہ اور اس سے وابستہ کام خاص واضح نہیں۔ مجتہد کے درجے تک پہنچ جانے کے بعد بھی برس ہا برس کی علمی تصنیفات اور مذہبی مباحث کا دور چلتا ہے کہ جس کی بنیاد پر خود مجتہد کے مدارج کا فیصلہ ہوتا ہے یوں اک مجتہد حجت الاسلام کے درجے سے ہوتا ہوا آیت اللہ اور پھر مرجع تقلید تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور تمام مجتہدین مرجع تقلید نہیں بن پاتے۔ وہ کون سے امور ہیں جن کی بنیاد پر کِسی مجتہد کا آیت اللہ کے درجے اور پھر مرجع کے رُتبے پر فائز ہونا ممکن ہو پاتا ہے۔ ایلویر کوربوز نے اپنی تحقیق میں اِن عوامل پر بحث کی ہے۔ ان کے مطابق کہنے کو تو مرجع کی خصوصیات میں علم، عدل اور تقویٰ کو کلیدی اہمیّت حاصل ہے لیکن بہت سے دیگر عوامل بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

کوربوز نے 41 مراجع کی حیات اور افکار کا مطالعہ پیش کیا ہے جو نجف میں مقیم ہے۔ ان میں سید علی حسینی سیستانی، اسحاق الفیاض، سید محمد سعید الحکیم اور بشیر حسین نجفی جیسے بڑے بڑے علما شامل ہیں۔ کوربوز کے نزدیک کسی بھی عالم کی قبولیت میں اس بات کو بھی اہمیّت حاصل ہے کہ اس کا تعلق کِس ملک سے ہے، اس نے کِس حوزہ علمی سے تربیت حاصل کی ہے اور اس کے اساتذہ میں کون لوگ شامل ہیں۔ عالم کی خاندانی تاریخ اور پس منظر بھی اہمیّت کا حامل ہے، جیسے کہ سعید الحکیم کا محسن الحکیم جیسے جیّد عالم کے خاندان سے ہونا۔ یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کِسی مجتہد کی عِلمیت کے بارے میں عوامی سطح پر جو رائے قائم ہوتی ہے،

اُس میں اِن عوامل کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اسی کی بنیاد پر ان کے مقلدین کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے جو اس مجتہد کی مالی حالت کو بھی استحکام بخشتا ہے۔ اس کی وجہ وہ مالی معاونت ہے جو مخیّر حضرات حوزہ کی تعمیر، طلبا کی کفالت اور کُتب کی اشاعت کے لیے کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں، شیعہ فقہ کے تحت مقلدین زکوٰۃ کے علاوہ خُمس بھی ادا کرتے ہیں۔ کِسی بھی مرجع کے نمائندے پوری دُنیا یا کِسی خطّے میں موجود اُن کے مقلدین سے یہ رقم اکٹھی کرتے ہیں۔ یوں ایک خطیر رقم جمع ہوتی ہے جو مختلف مصارف پر خرچ کی جاتی ہے۔

مراجع کی مقبولیت

جہاں تک مراجع کی مقبولیت کی بات ہے تو یہ بات بھی اہم ہے کہ ضروری نہیں کہ تمام شیعہ مسلمان کسی کے مقلّد ہوں کیونکہ شیعہ مذہب بالعموم ایک ثقافتی اور سیاسی شعور کے ساتھ بھی منسلک ہے جس میں فقہ کی قطعی اور سخت پابندی صرف ایک پہلو ہے اور جس کی تاریخ بھی زیادہ پُرانی نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ ایسے کئی مراجع بھی ہیں کہ جو اپنے اپنے علاقوں میں معتبر گردانے جاتے ہیں اور لوگ ہدایت کے لئے ان کی طرف دیکھتے ہیں۔ اِن میں ایک اہم نام آیت اللہ فضل اللہ کا ہے جن کا تعلق لبنان سے تھا اور وہ 2010 میں انتقال کر گئے۔ ان کے معتدل نظریات کی بِنا پر لبنان میں ان کے مقلدین کی ایک بڑی تعداد اب بھی موجود ہے۔ فی الوقت عراقی شیعہ عالم آیت اللہ سیستانی کو دُنیا بھر کی شیعہ آبادی میں سب سے زیادہ مقبول مجتہد گردانا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سیستانی کی اس غیر معمولی شہرت کی کیا وجہ ہے اور اس پوری صورتحال میں ہم ایران کے سیّد علی خامنہ ای کو کِس درجے پر رکھیں گے اور ان کی شیعہ دُنیا میں کیا اہمیّت ہے۔ اسی سے جُڑا ہے آیت اللہ خمینی کی اہمیّت کا سوال جن کے نظریۂ ولایتِ فقیہ نے مرجع کی حیثیت کو کِس انداز میں متاثر کیا ہے؟ یہ تمام سوالات آپس میں منسلک ہیں۔ پہلے بات کرتے ہیں علی سیستانی کی مقبولیت کی۔ کوربوز کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اور ان کے نظریے کا آیت اللہ سیستانی کے حالاتِ زندگی پر اطلاق کرتے ہوئے ہم ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ علی سیستانی کے حالاتِ زندگی، جو ان کی ویب سائٹ پر بھی درج ہیں، کے مطابق انھیں پچھلی صدی کے نامور ترین مراجع کا طالبِ علم ہونے کا شرف حاصل رہا ہے جن میں اہم ترین آیت اللہ العظمیٰ سیّد ابوالقاسم الخوئی، آیت اللہ العظمیٰ محسن الحکیم اور آیت اللہ العظمیٰ سیّد حسین طباطبائی بروجردی جیسے مجتہدین شامل ہیں یوں اہم ترین مراجع کی لڑی بروجردی، محسن الحکیم اور قاسم الخوئی سے ہوتی ہوئی سیستانی تک پہنچتی ہے۔ ان بزرگوں کی نہ صرف عِلمی قابلیت بلکہ ان کے تحت چلنے والے اداروں کی مالی معاونت اور اثر ورسوخ بھی سیستانی کی اہمیّت میں اضافے کا باعث ہے۔ قاسم الخوئی کی وفات کے کئی برس بعد بھی الخوئی فاؤنڈیشن پوری طرح مستعد انداز میں کام کرتی ہے اور درجنوں ممالک میں اس کی شاخیں قائم ہیں۔ اسلام آباد میں قائم جامعہ الکوثر کی خوبصورت اور عظیم الشان عمارت اسی فاؤنڈیشن کے کئی اہم منصوبوں میں سے ایک ہے۔

البتہ سیاسی اعتبار سے علی سیستانی کا عِلمی شجرہ جن مجتہدین سے منسلک ہے انھیں صُلح جو یا غیر سیاسی کہا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعث پارٹی کے جبر کے دور میں نجف میں بیٹھ کر حکومتِ وقت کو چیلنج کرنا موت کو آواز دینے کے مترادف تھا۔ جس کی واضح مثال موجودہ عراق کے اہم شیعہ کمانڈر اور عالم مقتدیٰ الصدر کے چچا محمد باقر الصدر ہیں جنھیں صدام حکومت نے 1980 میں تختۂ دار پر چڑھا دیا تھا کیونکہ ان کے سیاسی نظریات خطرے کا باعث بن رہے تھے اور انھیں عراق کا خمینی کہا جانے لگا تھا۔ ان کے برعکس محسن الحکیم اور قاسم الخوئی براہِ راست تصادم سے گریز کی پالیسی پر گامزن رہے تھے۔ سیستانی کے مرجع بننے کے بعد خود صدام حسین کی حکومت امریکی حملے اور پابندیوں کی وجہ سے کمزور ہو چکی تھی۔ یوں عراق پر امریکی قبضے کے بعد جب سُنّی اقلیتی حکومت ختم ہوئی تو کئی دہائیوں سے کُچلی گئی شیعہ سیاسی قوّت کو اظہار کا موقع مِلا جس کا فائدہ بھی سیستانی کو ہوا۔

مراجع کی اہمیت اور طاقت

اگر چہ مجتہدین یا علما نائبِ امامِ زمانہ شیعہ فِکر میں ہمیشہ سے اہمیت کے حامل رہے ہیں (اخباری اور اُصولی کی بحث میں اصولی مکتب کی کامیابی بھی اس کا اظہار ہے)، لیکن مرجع کی اصطلاح کی قبولیت اور اس سے جڑی ہوئی طاقت مختلف نوعیت کی حامل تھی۔ جدید دور کے ذرائع ابلاغ کی بدولت قبولیت کا یہ عالم ہے کہ عراق کے آیت اللہ سیستانی کے مقلدین بلتستان سے لے کر بیروت تک پھیلے ہوئے ہیں اور طاقت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مرجع کے ایک اشارے سے عراقی حکومت گِر سکتی ہے لیکن یہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔

مراجع کی گذشتہ ایک صدی کی تاریخ نے کئی نشیب وفراز دیکھے ہیں۔

محقق اور کتاب 'اجتہاد سے ولایت فقیہ تک' کے مصنف عباس امانت کے

مطابق آیت اللہ بُرجردی وہ پہلے مرجع تھے جنھوں نے مرجع کی طاقت کو مُنظم کیا اور جدید خطوط پر استوار کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب پہلوی آمریت، سوشلزم اور عرب قوم پرستی جیسے کئی چیلنجز کا سامنا تھا لیکن پھر بھی ان کے فتاویٰ یا احکامات کا دائرہ کار دینی معاملات تک محدود رہا یا پھر لادینیت کی قوتوں کی رد میں صرف ہوا۔

روح اللہ موسوی خمینی: آیت اللہ، مرجع، ولی فقیہہ یا امام

جو چیز روح اللہ خمینی کو ممتاز کرتی ہے وہ ان کا نظریۂ ولایتِ فقیہہ ہے جس کے تحت انہوں نے علما کو نائبینِ امام زمانہ اور اسلامی فقہ وعلوم کے ماہر ہونے کے ناطے سیاسی طاقت کا منبع قرار دیا۔ عام طور پر شیعہ مذہبی اور سیاسی فکر میں 'امامِ زمانہ' کے عرصۂ غیابت میں قائم کردہ ریاستی طاقت کو غاصبانہ سمجھا جاتا تھا لیکن آیت اللہ خمینی نے اس کے برعکس یہ اصرار کیا کہ ظہورِ امامِ زمانہ تک حکومت یا سیاسی طاقت سے دوری اختیار نہیں کی جاسکتی لہٰذا، بقول ان کے، ضرورت اس بات کی تھی کہ علما اور مجتہدین آگے بڑھیں اور اقتدار کی طاقت ہاتھ میں لے کر معاشرے کی اصلاح کریں۔ ان کے یہ نظریات 60 اور 70 کی دہائی میں شاہِ ایران کے جابرانہ دَور میں تشکیل پائے جس کے دوران انھیں ایک طویل جلاوطنی سے بھی گزرنا پڑا۔ ان سے پہلے کسی شیعہ مرجع نے علما کی سیاسی طاقت کا ایک مربوط نظریہ پیش نہیں کیا تھا کہ جس کے تحت علماء کی طاقت اب محض مذہبی معاملات تک محدود نہیں تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مذہب اب صرف عقائد اور عبادات کے دائرے تک محدود نہیں تھا۔ اس میں سیاست، حکومت، ثقافت، معاشرت، تجارت اور قانون بھی شامل تھا۔ علما کی اس لامحدود شخصی طاقت کو نافذ کرنے اور ان کے اعلیٰ ترین علمی اور عملی درجے پر فائز ہونے کے ناطے خمینی اب صرف حجت الاسلام یا آیت اللہ نہیں رہے تھے، وہ آیت اللہ العظمیٰ یا اصطلاحی معنوں میں امام بن چکے تھے لہٰذا ایران میں اب بھی سرکاری طور پر انھیں امام خمینی کہا جاتا ہے۔ آیت اللہ العظمیٰ خمینی کے ولایتِ فقیہہ کے نظریے میں اس درجے پر فائز شخص کو اس حد تک اختیار حاصل تھا کہ وہ اہم مذہبی عبادات میں پر نظرِ ثانی کر سکے۔ انھوں نے کہا کہ ولایتِ فقیہہ کے زیرِ اثر چلنے والی ایک صحیح اسلامی حکومت عبادی معاملات میں دخل اندازی کر سکتی ہے جیسے کہ حج پر کسی وجہ سے عارضی پابندی۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک اسلامی حکومت جو نبی کی کامل نیابت کا ناگزیر حصہ ہے، کا قیام اسلام کا بنیادی جُزو ہے۔ آیت اللہ العظمیٰ خمینی کے نظریہ ولایتِ فقیہہ نے نہ صرف مرجع کو ایک اعلیٰ ترین درجے پر فائز کر دیا بلکہ اسے ایک سیاسی اور انتظامی عمل کا حصّہ بھی بنا دیا لیکن جو معیار اس کے لیے وضع کیا اس پر ان کے علاوہ کسی اور کو فائز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کا حصول اس طویل جدوجہد کا نتیجہ تھا جس کی وجہ سے ایران میں انقلاب برپا ہوا اور بہت سے لوگوں نے ایک خاص عرصے میں روح اللہ خمینی کو ایک طِلسماتی شخصیت کے طور پر دیکھا۔ 1989 میں ان کی وفات کے بعد اتنا اہم عہدہ اور اختیار کسی ایک شخص کو دینا خود ایرانی حکومت کے لیے بھی نقصان دہ ہوتا۔ اگرچہ خمینی کے جانشین کے طور پر علی مُنتظری مضبوط امیدوار تھے لیکن پھر باہمی اختلافات کے نتیجے میں وہ اس اہم منصب سے دور ہو گئے اور اپنی وفات تک ایرانی حکومت کے ناقدر رہے۔ پھر ایرانی آئین میں ترمیم کے ذریعے رہبر کے لیے مرجع ہونے کی شرط ختم کر دی گئی۔ نگہبان شوریٰ کی طرف سے آیت اللہ خمینی کی جگہ آیت اللہ خامنہ ای کو ملک کا نیا روحانی پیشوا منتخب کیے جانے سے پیشتر اُن کا درجہ محض حجت الاسلام کا تھا جو آیت اللہ کے درجے سے نیچے ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھیں آیت اللہ کے درجے پر فائز کرنے کے لیے چیدہ چیدہ علما جیسے کہ محمد رضا گلپایگانی سے بھی اجازت حاصل کرنے کی گزارش کی گئی لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور علی مُنتظری نے، جو کسی زمانے میں خامنہ ای کے اُستاد بھی رہے تھے، کُھل کر ان کی علمی قابلیت کو ہدفِ تنقید بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ بطور مرجع، علی خامنہ ای کو وہ پذیرائی حاصل نہیں جو دوسرے مراجع کو حاصل ہے، یا پھر یوں کہا جائے کہ ان کی مقبولیت میں بنیادی کردار ایرانی ریاست کے پھیلتے ہوئے اثر ورسوخ کا ہے کہ جو اکثر شیعہ آبادیوں میں مدارس قائم کرنے میں فعال کردار ادا کر رہی ہے۔ ورنہ انھیں شاید اس درجہ پذیرائی نہ مل پاتی۔ یوں مرجع کے منصب کا طاقت، سیاست اور ریاست کے ساتھ جُڑ جانا ایک طرف سے فائدہ مند بھی ہے، لیکن اس سے نقصان بھی پہنچا ہے۔ ایرانی مدارس، خاص طور پر قم، صدام حسین کے دور میں شیعہ علمی و مذہبی مرکز بنا کیونکہ نجف میں ریاستی جبر کے باعث سرگرمیاں بہت محدود ہو چکی تھیں۔ پاکستان، افغانستان اور دیگر غیر عرب ممالک سے سینکڑوں شیعہ طلبا دین کی تعلیم کے لیے قم کا انتخاب کرتے رہے مگر گذشتہ چند برسوں میں نجف کی علمی سرگرمیاں بحال ہوئی ہیں۔ خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد کافی حد تک امن آ چکا ہے جس کی وجہ سے مذہبی سیاحت کو فروغ مل رہا ہے۔ ایسے میں جبکہ نجف اور کربلا یوں بھی شیعہ اسلام کی تاریخ اور تہذیب کا مرکز ہیں اور وہاں کے مدارس پر ریاستی کنٹرول ویسا نہیں ہے جیسا کہ ایران میں ہے، تو لامحالہ طور پر نجف کے حوزۂ علمی اور اس سے جڑے مراجع کے وقار میں اضافہ

ہوا ہے۔

کیا نجف 'ویٹی کن' بن جائے گا؟

مہدی خلی سمیت کچھ اور تجزیہ کار یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دور ختم ہونے کو آرہا ہے جس میں مرجع بطور ایک فرد کے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ایران میں علی خامنہ ای 80 برس کے ہو چکے ہیں جبکہ عراق میں آیت اللہ سیستانی کی عمر اس وقت 98 برس ہے اور جس تاریخی جدو جہد اور وسائل کے نتیجے میں علی سیستانی اس مقام پر پہنچے ہیں ان کا متبادل مِلنا مشکل ہے۔ ایران میں چونکہ یہ انتظام سرکاری سرپرستی میں چلا گیا ہے، لہٰذا اس کے رجحانات مختلف ہوں گے۔ مرجع کے عہدے میں ایک خاص طرح کی انتظامی مرکزیت اور اسے جدید اصولوں پر استوار کرنے کا عمل گذشتہ کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ اس کی بڑی مثالیں الخوئی فاؤنڈیشن، الحکیم فاؤنڈیشن اور آیت اللہ فضل اللہ کے قائم کردہ مراکز ہیں جو اِن کی وفات کے بعد بورڈ آف گورنر کے صلاح مشورہ سے چلائے جاتے ہیں۔ جہاں تک عِلمی معاملات کا تعلق ہے، تو اس وقت بھی لگ بھگ 200 مجتہدین جو آیت اللہ کے درجے پر گنے جاسکتے ہیں اور جن میں درجن بھر ایسے ہیں کہ جو شیعہ عِلمی و مذہبی حلقوں میں معروف ہیں۔ کیا کوئی ایک مرجع اس تمام سیاسی عِلمی اور کرشماتی طاقت کا ارتکاز کر پائے گا جو آیت اللہ علی سیستانی کے پاس ہے۔ ایسا ہونا مشکل ہے، اس میں وقت لگ سکتا ہے۔ اس عمل کو سمجھنے کے لیے ویٹی کن کا حوالہ اکثر استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ قارئین آگاہ ہیں، رومن کیتھولک چرچ کے سربراہ کے انتخاب کا طریقہ متعین ہو چکا ہے جو ایک دفعہ منتخب ہو جانے کے بعد عموماً تاحیات اس عہدے پر فائز رہتا ہے اور تمام کیتھولک مسیحیوں کا سربراہ ہوتا ہے۔ ایسی غیر منقسم قیادت کسی شیعہ مرجع کو حاصل نہیں اور نہ ہی اس بات کا امکان ہے۔ بالفرض عراق یا نجف کی حد تک ایسا ممکن ہو بھی جائے تو ایران ہرگز نہیں چاہے گا کہ شیعہ مذہبی قیادت کسی اور خطے میں منتقل ہو جائے۔ مذہبی رہنمائی کے ذریعے ریاستی مفادات کا پھیلاؤ اور تحفظ ایرانی خارجہ پالیسی کا اہم جزو ہے۔ یوں ویٹی کن کی طرز پر شخصی نظام نہ سہی، لیکن مرجع کا عہدہ ایک اجتماعی نظام کی طرف ضرور بڑھ رہا ہے جس میں ایک سے زیادہ مراکز ہوں گے اور جو اپنی اپنی عِلمی سیاسی تاریخ کی بنیاد پر معاملات کو چلائیں گے۔

مرجع کا عہدہ اور ایران

اس سے وقتی طور پر شاید مرجع کی انفرادی طاقت سیاسی معاملات پر کمزور پڑ جائے گی۔ خود ایران کے اندر بھی جانشینی کا معاملہ گھمبیر ہوگا کیونکہ ایرانی حکومت بہر حال یہ نہیں چاہے گی کہ ایک طاقتور اور مقبول شخص مرجع کے عہدے پر فائز ہو اور ایسا نہ کرنا بھی ریاستی ڈھانچے کو کمزور کرے گا جو پہلے ہی پابندیوں اور مختلف طرح کے سیاسی و سماجی تضادات کے نتیجے میں بُری طرح کمزور ہو چکا ہے۔ اٹلانٹک کونسل کے لیے لکھی گئی رپورٹ میں سیستانی کے جانشین کے لیے جن ممکنہ مراجع کا ذِکر کیا گیا ہے ان میں شیخ اسحاق الفیاض (پیدائش افغانستان)، سید محمد سعید الحکیم (پیدائش عراق)، شیخ محمد باقر اروانی (پیدائش عراق)، شیخ ہادی الرازی (عراق) اور شیخ محمد السند (پیدائش بحرین) شامل ہیں۔ ادھر ایران میں مرجع کی دوڑ کے لیے ملک کے موجودہ چیف جسٹس 58 سالہ ابراہیم رئیسی، ایران کے موجودہ صدر حسن رُوحانی، ایرانی نظامِ انصاف کے سابق سربراہ صادق اردشیر لاریجانی، آیت اللہ خمینی کے پوتے حسن خمینی، علی خامنہ ای کے صاحبزادے مجتبیٰ خامنہ ای اور محمد ری شہری شامل ہیں۔ کون کِس کا جانشین بنے گا، حتّمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن مرجع کا درجہ اب تاریخ کے ایک نئے مرحلے میں داخل ہونے جا رہا ہے جس کے دُور رَس اثرات خطّے کی سیاست اور شیعہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگیوں پر مرتّب ہوں گے۔ (بشکریہ بی بی سی)

❁❁❁

مقابلہ ڈاکومینٹریز

لاہور انٹرنیشنل کے یوٹیوب چینل کے لیے مختصر دورانیئے کی ڈاکومینٹریز بنائیں اور انعام پائیں۔ زیادہ سے زیادہ ویڈیوز بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے مواقع پائیں۔ ان ڈاکومینٹریز کا موضوع معاشرتی، معاشی، ......ہو۔ ان ڈاکومینٹریز کو یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔ تکنیکی معاملات کے ساتھ ساتھ نتائج کا فیصلہ.....اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسند ناپسند دیکھ کر کیا جائے گا۔

ہر ماہ ڈاکومینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکومینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

مریض کی عیادت اور ہم

تحریر: عبدالوکیل شیخ، کوئٹہ

اس مضمون کو لکھنے کی اصل وجہ آجکل کی صورتحال سے بنفس نفیس گزرنا بن رہی ہے۔ کچھ عرصہ قبل ایک ویڈیو غالباً ایران کی تھی جس میں ایک شخص سڑک کنارہ پڑا کھانس رہا تھا اور ایک شخص اس کی ویڈیو تو بنا رہا تھا مگر اس کو ہسپتال پہنچانے میں شاید خوف محسوس کر رہا تھا کہ کہیں وہ بھی کورونا کا شکار نہ ہو جائے اس کے کچھ عرصہ بعد ایران میں موتٰی موتی کا وہ بازار گرم ہوا کہ الامان والحفیظ جب یہ ویڈیو نظر سے گزری تو نہایت افسوس یہ ہوا کہ آخر اس کو لوگ اٹھا کیوں نہیں رہے اور جذبہ ہمدردی اپنے عروج پر تھا اور خود سے ضمیر یہ عہد لے رہا تھا کہ اگر کبھی میرے سامنے ایسا ہوا تو خدا تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ ضرور ایسے شخص کی مدد کی جائے گی۔ شاید اس وقت پاکستان میں کورونا نیا نیا تھا بعد میں کثرت مطالعہ ایس۔او۔پیز کے تقاضوں کا مطالعہ اور آئے دن ٹی۔وی پر کورونا کی صورتحال دیکھنے کے بعد عہد تو قائم رہا دل بھی مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ اس عہد کو وفا کیا جائے گا پھر ایک دن ہوا کچھ یوں کہ روت ہی بدل گئ! ہمارے محلہ میں ہی ایک شخص جو ہمیشہ جب اس سے کوئی کام کہا گیا اس نے وقت دیا اور اخلاص ووفا کا پیکر بنا رہا کچھ بیمار پڑ گیا خیر اس کی تیمارداری ہوتی رہی اور کوشش کی گئ کہ اس کا جو بھی کام ہو کرنا درحقیقت سعادت عظمیٰ ہے اس تمام معاملہ کے دوران احتیاطی پہلوؤں کو جسقدر ہو سکا مدِنظر رکھا گیا پھر یوں ہوا کہ درد کی لذت بدل گئ !ایک صبح ایک ڈاکٹر نے یہ شبہ ظاہر کر دیا کہ موصوف کورونا کا مریض ہے اب تھی ضمیر کی آواز کہ اس کو نہیں چھوڑنا کسی اور ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے پھر ایک اور ڈاکٹر نے بھی یہی وعید دے دی اور کہا کہ اس کو فوراً ہسپتال میں ایڈمٹ کرا دیں پھر کیا تھا چاروناچار دل شکستہ اس بھائی کو لے کر ہسپتال پہنچے اور داخل کرا دیا اللہ جانتا ہے کہ دل پر کیا بیت رہی تھی کبھی دل کرتا کہ اس کے ساتھ ایک تصویر ہی لے لی جائے پھر دل میں خیال آیا کہ اس سے اس کے دل کو ٹھیس پہنچے گی بمشکل رونے پر قابو پایا اور گھر کی طرف ہزاروں خیالوں کو لے کر روانہ ہوئے ابھی گھر پہنچے ہی نہ تھے کہ محلہ میں کچھ ایسے دوست جو گھنٹہ قبل ایس۔او۔پیز کی دھجیاں مل کر اڑایا کرتے تھے مجھے دیکھ کر یوں بھاگنے لگے جیسا کہ بچپن میں ایک فلم لگا کرتی تھی جس میں ایک ڈرائیکولا جس کسی کو دانت لگا دیتا وہ بھی ڈرائیکولا کی شکل اختیار کر لیتا تھا اس زمانے میں تو یہی سمجھ آتی تھی پھر بڑے ہوئے تو پتہ چلا کہ یہ تو زومبیز بن جاتے ہیں خیر یہ اصطلاح بھی سمجھانے کا وقت نہیں خیر اب محسوس ہونے لگا کہ ہم بھی زومبیز بن چکے ہیں۔ گھر پہنچ کر سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ ایس۔او۔پیز کے تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے حفاظتی سامان شاپر میں بند کر کے ڈسٹ بن کی نظر کر دیا پھر جس لباس میں تھے اسی میں نہاتے رہے اور پھر وہ لباس خود دھویا یہ شادی کے بعد پہلی بار تھا کہ کپڑے دھونے کا موقع ملا تو دل میں بیگم کے لیے تشکر کے جذبات بھی موجزن ہوتے دکھائی دیئے۔ اب مرحلہ شروع ہوا کہ جس کا تھوڑا بھی بلند سماجی قد تھا یا وہ سمجھتا تھا کہ اس کو کسی قسم کی برتری حاصل ہے اس نے اپنی توپوں کا رُخ ہماری طرف کر دیا اگر کہا جائے کہ ۹۹ فیصدی لوگ تو محض یہی سمجھنے لگے کہ میں کورونا کا مریض بن چکا ہوں اب بشری کمزوری کہا جائے یا پھر نفسیاتی دباؤ ہوُا کچھ یوں کہ پوری رات انہی اندیشوں میں گزارنے لگے خیر مرتا کیا نا کرتا دل شکستہ و نہ گرفتہ دعا کی طرف توجہ ہوئی اور اب دعا یہ ہو رہی ہے کہ اے اللہ جس مریض کو لے کر گئے ہیں اس کی رپورٹ نیگٹو آ جائے پھر ستم ظریفی یہ کہ ہم پاکستان میں رہتے ہیں اور رپورٹ بھی جلدی آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اللہ اللہ کر کے چار دن بعد صبح ایک دوست کا فون آیا اور اس نے کہا کہ جس مریض کو آپ لے کر گئے تھے اس کی رپورٹ نیگٹو آئی ہے اب خوشی کی انتہاء نہ رہی۔ اب ۹۹ فیصدی لوگوں کے علاوہ وہ جو ایک فیصد لوگ تھے جنہوں نے دعائیں اور تسلیاں دی تھیں باری باری ان کا شکریہ ادا کرنے کا دل چاہا اور جسقدر ہو سکا ادا کیا اور سب سے بڑھ کر اس خدا کا شکر ادا کیا جس نے اس بھائی کو بھی صحت دی اور مجھے بھی اس ابتلاء سے نکال دیا۔ اب قصہ مختصر یہ کہ میرے بھائیو! خدارا ایس۔او۔پیز کا خیال رکھو احتیاط بھی کرو مگر اپنے وطن عزیز کو بچانے کے لیے اور انسانیت کو بچانے کے لیے اس ہمدردی کو نہ چھوڑو جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں کیا ہے

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ

(سورۃ البلد آیت 18) پھر وہ اُن میں سے ہو جائے جو ایمان لے آئے اور صبر پر قائم رہتے ہوئے ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں اور رحم پر قائم رہتے ہوئے ایک دوسرے کو رحم کی نصیحت کرتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اصحاب الیمین یعنی دائیں طرف والے ہیں جو کامیاب

ہونے والے ہیں۔

دوسری طرف اس حدیث قدسی پر بھی نظر رکھیں قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ " إِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ یَقُولُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یَا ابْنَ آدَمَ مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِی قَالَ یَا رَبِّ کَیْفَ أَعُودُکَ وَأَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِینَ؟ قَالَ أَمَّا عَلِمْتَ أَنَّ عَبْدِی فُلَانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْہُ؟ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّکَ لَوْ عُدْتَہُ لَوَجَدْتَنِی عِنْدَہُ؟

(مشکوۃ المصابیح کتاب الجنائز باب عیادۃ المریض وثواب المرض الفصل الاول)

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن اللہ عز وجل کہے گا اے ابن آدم! میں بیمار ہوا تھا اور تو نے میری عیادت نہیں کی؟ بندہ کہے گا کہ اے میرے رب میں کیسے تیری عیادت کرتا جبکہ تُو تو رب العلمین ہے؟ اللہ فرمائے گا کہ کیا تجھے پتہ نہیں چلا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور تو نے اس کی عیادت نہ کی؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے ہاں پاتا؟۔

پھر زمانہ کے امام حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کا تو یہ شعر ہی اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے اگر دل میں ہو خوف کردگار

مرا مقصود و مطلوب و تمنا خدمت خلق است
ہمیں کارم ہمیں بارم ہمیں رسم ہمیں راہم

گزارش یہ ہے کہ میرا مقصد ہرگز اور ہرگز یہ نہیں کہ دیوانوں کی طرح دیوار سے سرٹکرایا جائے نہ ہی میرا یہ مقصد ہے کہ انسان احتیاطی پہلوؤں کو چھوڑ کر مریض کے ساتھ خود بھی مریض بن جائے مگر میرا مقصد یہی ہے کہ تمام احتیاطی تقاضے پورے کرکے گھر کے باہر کسی کو مرتا دیکھ کر گھر کا دروازہ بند نہ کر دیا جائے اور نہ ہی یہ کیا جائے کہ اگر خود کوئی کام نہ کرسک رہے ہوں تو جو شخص یہ کام کرنے لگے اس کو معاشرہ میں اچھوت بنا دیا جائے میری التجاء ہے کہ جاگنا پڑے گا نہیں تو مشکل ہو جائے گی اور کہیں ہماری بھی اس بے بس انسان کی طرح ویڈیو نہ بن رہی ہو اس لیے ہوش کرو ہوش کرو۔

ایک اور بات یہ کہ گورنمنٹ کی طرف سے ٹائیگر فورس ایک بہت اچھا قدم ہے مگر یاد رکھو کہ اس میں نام لکھوا لینا اور موصول شدہ ایس۔ایم۔ایس کا چرچا کر لینا کافی نہیں بلکہ یاد رکھیں کہ ٹائیگر فورس آپ تب بنیں گے جب آپ کے اندر کا ٹائیگر بے حس اور خواب غفلت میں نہ ہوگا!!!!

❀❀❀

اشتہارات کے لیے

رسالہ ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں قارئین مطالعہ کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں اپنے اشتہارات شائع کروا کر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشہیر، مشہوریت کر سکتے ہیں معلومات کیلئے آپ ہمارے نمائندگان اور ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور انٹرنیشنل youTube چینل کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ تمام معلومات اس رسالے میں موجود ہیں شکریہ۔

http:www.youtube.com/channel/
UCwM31ueU85MOWeH0UBFhMYw

لاہور انٹرنیشنل رسالہ کی توسیع اشاعت میں حصّہ لینا آپ کا قومی فرض ہے۔ اور اس کے اعانت فنڈ میں اپنا حصّہ ڈالیں۔

کشمیر یہ لہو چھپائے نہ چھپے گا، یہ بغاوت دبائے نہ دبے گی

تحریر: یاسر ارشاد

کشمیر کی خصوصی حیثیت کا خاتمہ خطے کی بعد از تقسیم تاریخ کا سب سے بڑا اور دھماکہ خیز اقدام ہے۔ آنے والے عرصے میں اپنے اثرات کے حوالے سے یہ ممکنہ طور پر تاریخ کا ایک فیصلہ کن موڑ کہلائے گا۔ مسئلہ کشمیر کی تاریخی حیثیت کو اس نے یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے اور ایک حوالے سے اس تنازعہ کی اب تک کی کیفیت کو مکمل طور پر ختم کر دیا ہے۔ 5 اگست 2019ء سے پہلے گزشتہ 72 سالوں کے دوران کشمیر تنازعہ کی ایک خاص حیثیت تھی جس کو پاک بھارت ساڑھے تین جنگوں، دوطرفہ مذاکرات اور عالمی سفارتکاری سمیت کشمیر میں جاری تحریک کے مجموعی اثرات بھی تبدیل نہیں کر سکے، اس حیثیت کو بھارتی حکومت کے اس فیصلے نے مکمل طور پر ختم کر دیا ہے۔ یہ ایک انتہائی اہم اور فیصلہ کن تبدیلی ہے جو اس پورے خطے کی سیاست، معیشت اور سفارتکاری سمیت سماج کے ہر پہلو پر دوررس اثرات مرتب کرے گی۔ مسئلہ کشمیر کے حوالے سے یہ ایک بالکل نئے مرحلے کا آغاز ہے لیکن اس کی نوعیت اور سمت بالکل غیر متوقع ہے جس نے زیادہ تر سیاسی حلقوں کو کنفیوز کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ اقدام زیادہ تر لوگوں کے لئے حیران کن ہے کیوں کہ مسئلہ کشمیر میں کسی پیش رفت کی توقع رکھنے والے بھی اس قسم کی تبدیلی کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ سوشل میڈیا سمیت ابلاغ کے سبھی ذرائع اس اقدام پر تند و تیز مباحثوں کے ذریعے اس کی تفہیم کی کوششوں میں مصروف ہیں لیکن کہیں بھی کوئی تسلی بخش وضاحت نہیں کر پا رہا۔ سب سے زیادہ بانجھ پن پر مبنی مؤقف نام نہاد بائیں بازو کا ہے جو اس کو مودی کے ہندوتوا کے نظریات یا ہندو فاشزم کا شاخسانہ قرار دے رہے ہیں۔ درحقیقت یہ اقدامات عالمی سطح پر سرمایہ داری نظام کے زوال اور شکست و ریخت کے عمل کی پیداوار ہیں جن کو اس عمومی تبدیلی کے عمل کے تسلسل میں ہی درست طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کے نامیاتی زوال کے اس تبدیل شدہ عہد کا انقلابی تحریکوں کے ابھار، ردانقلابی خانہ جنگیوں سمیت وحشیانہ ریاستی جبر کی نئی اور پہلے سے زیادہ درندگی پر مبنی شکلوں کے ذریعے اظہار ہو رہا ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں طویل عرصے سے قائم سیاسی و سماجی توازن دھماکہ خیز انداز میں ہر قسم کے واقعات کے ذریعے ٹوٹ کر بکھر رہا ہے۔

چند ماہ پہلے ہونے والے ہندوستان کے عام انتخابات میں مودی کی بھاری اکثریت سے فتح بھی اسی قسم کا ایک واقعہ تھا جس میں ہندوستانی سماج میں جاری تبدیلی کے عمل نے سب سے پہلے ہندوستانی سماج کی عرصے سے ایک ہی ڈگر پر چلی آنے والی سیاست کے خاتمے کا اعلان کیا تھا۔ قنوطیت (مایوسی) پسندوں کے لئے مودی کی انتخابی فتح سماج پر فاشزم کے تسلط کا اعلان تھا جس طرح امریکہ میں ٹرمپ کی انتخابی فتح کو اس بدبودار مخلوق نے امریکی فاشزم کی مضبوطی قرار دیا تھا لیکن درحقیقت یہ دونوں فتوحات بائیں بازو کی اصلاح پسندی کی ناکامی کے باعث دائیں بازو کی سٹیٹس کو مخالف پارٹیوں کے ذریعے موجودہ صورتحال سے نجات پانے کی عوام کی ایک مایوس کن کوشش تھی۔ گزشتہ چند ماہ سے جاری سوڈان کی انقلابی تحریک اور ہانگ کانگ میں ہونے والے طوفانی انقلابی واقعات اسی سٹیٹس کو کو ایک انقلابی بغاوت کے ذریعے تبدیل کرنے کی کوشش ہیں۔ یہ دونوں قسم کے واقعات عالمی سطح پر جاری تبدیلی کے ایک ہی عمل کا دو یکسر مختلف بلکہ الٹ طریقوں سے اظہار ہیں۔ اسی طرح یمن پر سعودی جارحیت، فلسطین پر اسرائیل کی بڑھتی ہوئی بربریت، چین میں مسلمان آبادی پر

چینی ریاست کی وحشیانہ ریاستی جارحیت، پاکستان میں بنیادی جمہوری آزادیوں کو وحشیانہ ریاستی جبر کے ذریعے ختم کئے جانے کے اقدامات اور بھارتی ریاست کی جانب سے کشمیر کی نیم خودمختار ریاستی حیثیت کو فوجی جبر کے ذریعے ختم کرنے کے اقدامات بھی سماج کی بنیادوں میں جاری تبدیلی کے عمل میں معیاری جست کی عکاسی ہے۔ یہ دنیا ایک دیوہیکل تبدیلی کے عمل سے گزر کر معیاری طور پر ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جہاں پرانی دنیا کے ظاہری خدوخال اگر کہیں باقی بھی ہیں تو وہ آنے والے دنوں اور مہینوں میں اسی طرح اچانک تبدیل ہو جائیں گے۔ سطح پر نمودار ہونے والے یہ واقعات کتنے ہی اچانک اور غیر متوقع کیوں نہ ہوں درحقیقت ان واقعات کو جنم دینے والے عناصر واسباب سماج کی ظاہری سطح کے نیچے اس مقدار و معیار کو حاصل کر چکے ہیں جہاں وہ ہر قسم کے واقعات کو ایک دھماکے کے ذریعے سماج کی سطح پر نمودار کرنے کے لئے مکمل طور پر پختہ ہو چکے ہیں۔ یہی وہ بنیاد ہے جس کے تسلسل میں ہی موجودہ اقدامات کی درست وضاحت ممکن ہے۔

کشمیر کی خصوصی حیثیت کا خاتمہ

5 اگست 2019 کو بھارتی وزیر داخلہ امیت شاہ نے ایک صدارتی حکم نامہ بھارت کی راجیہ سبھا یا ایوان بالا میں پیش کیا جس میں ہندوستانی آئین کی شق نمبر 370 کے خاتمے کا اعلان کیا گیا تھا۔ راجیہ سبھا میں اس پر مختصر بحث ومباحثے کے بعد 61 کے مقابلے میں 125 ووٹوں سے جبکہ لوک سبھا میں 67 کے مقابلے میں 367 ووٹوں سے اس کو منظور کر لیا گیا ہے۔ ہندوستانی آئین کی شق نمبر 370 مہاراجہ کشمیر کے الحاق ہندوستان کی دستاویز کا ہی تسلسل تھا جس کے ذریعے کشمیر کو ہندوستانی وفاق میں ایک مخصوص حیثیت کو برقرار رکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس شق کے مطابق کشمیر کی ریاست کے امور خارجہ، مواصلات اور دفاع کا انتظام واختیار مرکزی یا وفاقی حکومت کے پاس ہوگا جبکہ باقی تمام امور کا اختیار ریاست کی قانون ساز اسمبلی کے پاس ہوگا۔ اس کے ساتھ کشمیر کی ریاست کو اپنا آئین بنانے اور اپنا الگ جھنڈا رکھنے کے اختیار کے ساتھ یہ استثنا بھی حاصل تھا کہ ہندوستان کے مکمل آئین کا اطلاق کشمیر میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ مہاراجہ ہری سنگھ کا بنایا ہوا ایک اور قانون جس کو باشندہ ریاست کا قانون بھی کہا جاتا ہے، جس کے مطابق کوئی بھی غیر کشمیری کشمیر میں زمین کی ملکیت اور سرکاری ملازمت جیسی کوئی بھی مراعات حاصل نہیں کر سکتا، کو بھی شق نمبر 35A کے ذریعے آئین کا حصہ بنا دیا گیا اور ان آئینی شقوں میں ریاست یا مرکز دونوں ایک دوسرے کی مکمل رضامندی کے بغیر کوئی تبدیلی نہ کر سکنے کے پابند قرار دیے گئے۔ لیکن اب ان شقوں کے خاتمے کے ذریعے بھارتی مقبوضہ کشمیر کی ایک نیم خودمختار ریاست کی حیثیت کے ساتھ ہر قسم کی داخلی خودمختاری کو ختم کرتے ہوئے کشمیر کو دو انتظامی اکائیوں میں تقسیم کر کے "Union Territory" کا درجہ دیتے ہوئے براہ راست مرکز کے کنٹرول میں لے لیا گیا ہے۔ لداخ کو الگ مرکز کے تابع انتظامی اکائی بنایا گیا ہے جس کی کوئی اسمبلی نہیں ہوگی جبکہ جموں اور کشمیر کے علاقوں کو الگ انتظامی اکائی بنایا گیا ہے جس کی اپنی قانون ساز اسمبلی ہوگی لیکن دونوں علاقوں میں وفاقی حکومت کی جانب سے مقرر کردہ ایک لیفٹیننٹ گورنر ہی سب سے بااختیار حاکم ہوگا۔ یوں اس پورے خطے اور عالمی سطح پر گزشتہ سات دہائیوں سے کشمیر کی تسلیم شدہ متنازعہ حیثیت کو ختم کرتے ہوئے کشمیر کے بھارتی قبضے میں موجود حصے کو بھارت کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ کشمیر کی اس خصوصی حیثیت کا ایک پہلو کشمیر کے حکمران طبقات کی مراعات اور اختیارات کا ہے جبکہ دوسرا پہلو کشمیر کی عوام، محنت کش طبقے اور نوجوانوں کی ہندوستان کے وحشیانہ جبر سے آزادی کے حصول سے منسلک ہے۔ کشمیر کے حکمران طبقات کی سبھی سیاسی پارٹیاں اور گروہ اس خصوصی حیثیت کے باعث کشمیر کے داخلی معاملات اور لوٹ مار کے حوالے سے دیگر ریاستوں کے حکمرانوں کے مقابلے تقریباً مکمل آزاد اور بااختیار تھے۔ یہ حکمران بھارتی ریاست کی مکمل دلالی کرتے رہے اور انہوں نے کشمیری عوام پر ڈھائے جانے والے وحشیانہ مظالم کے خلاف کبھی کوئی سنجیدہ احتجاج تک نہیں کیا۔ وہ بھارتی ریاست جس نے کشمیر کو گزشتہ تین دہائیوں سے وہاں کے باسیوں کے لئے ایک عقوبت خانہ بنا رکھا ہے یہ حکمران اسی بھارتی ریاست کے تنخواہ دار ملازم ہیں اور اپنی حاکمیت میں وہاں بھارتی ریاست وحشت اور بربریت کا خونی کھلواڑ کر رہی ہے۔ ان حکمرانوں کے لئے موجودہ اقدامات کا مطلب محض یہ ہے کہ ان کی اپنی مراعات اور اختیارات میں کمی ہو رہی ہے۔ لیکن دوسری جانب خصوصی حیثیت کا حامل کشمیر بھی کشمیری عوام، محنت کشوں اور نوجوانوں کے لئے عملاً ایک خصوصی اذیت گاہ، جیل اور مقتل ہی تھا جہاں ہندوستانی فوج کو کشمیریوں کے خون کے دریا بہانے، خواتین کی عصمت دری کرنے، ماورائے عدالت قتل کرنے اور پیلٹ گن جیسے مہلک ہتھیاروں سے ان کو بینائی سے محروم کرنے کے خصوصی اختیارات حاصل تھے۔ کشمیری عوام کی اکثریت تو اس خصوصی حیثیت کے حامل کشمیر میں بھی اپنے لہو کا خراج دے کر زندہ تھی۔ کشمیر کی حیثیت میں موجودہ

تبدیلی کا درحقیقت سب سے المناک پہلو یہی ہے جس کی وضاحت کے بغیر تمام تر شور شرابہ بے معنی اور بکواس پر مبنی ہے۔ بھارتی آئین میں کشمیر کی خصوصی حیثیت کو تحفظ فراہم کرنے والی تمام شقوں کی موجودگی کے باوجود اگر کشمیری عوام کی زندگی ایک خونریز جہنم کے مانند تھی اور اس سے نجات کی جدوجہد ایک کے بعد دوسری بغاوت کی صورت میں اپنا اظہار کرتی آئی ہے تو اس نئے ریاستی حملے سے اس صورتحال کو تو تبدیل کرنا ممکن نہیں ہوسکتا۔ یہ درست ہے کہ ان شقوں کی موجودگی بھی کشمیری عوام کے لئے کسی تحفظ کا باعث نہیں تھی لیکن ان کی موجودگی کو کشمیر پر بھارتی قبضے کی عارضی نوعیت اور کشمیریوں کی ہندوستان سے الگ اپنی شناخت و پہچان کا ضامن سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے ان شقوں کا خاتمہ کشمیر کی الگ شناخت کو مکمل مٹانے کا جبری فیصلہ ہے جو پہلے سے موجود سامراجی جبر کی درندگی میں اضافے کی عکاسی کرتا ہے۔ کشمیر کی اس خصوصی حیثیت کا ایک تیسرا پہلو یہ تھا کہ کشمیر پر قابض دونوں سامراجی ممالک اس کو متنازعہ علاقہ تسلیم کرتے تھے اگرچہ دونوں سامراجی ممالک کے حکمران طبقات اپنے زیر مقبوضہ علاقے پر اپنے تسلط کو برقرار رکھنے کے لئے مختلف قانونی و اخلاقی جوازات کو استعمال کرتے آئے ہیں۔ کشمیر کی یہ تسلیم شدہ متنازعہ حیثیت ہندو پاک دشمنی کی بنیاد تھی جس پر اس خطے کی ان سامراجی ریاستوں کے مخصوص تعلقات استوار تھے جس کو بھارتی حکومت کے موجودہ فیصلے نے ایک دھماکے سے اڑا دیا ہے۔ یہ فیصلہ ایک زبردست بھونچال کی مانند ہے جس نے سات دہائیوں سے قائم ایک نازک توازن کے پرخچے اڑا دیے ہیں اور پورے خطے کو ایک بالکل نئی اور انجانی کیفیت میں دھکیل دیا ہے۔ پاک بھارت جنگ و امن کے ناٹک کا سارا کھیل کشمیر کی اسی متنازعہ حیثیت پر کھیلا جاتا تھا جس کا اب خاتمہ ہوگیا ہے اور آنے والے دنوں میں اس سارے کھیل کو ماضی کی طرح جاری رکھنے کی بنیادیں مسمار ہوچکی ہیں۔ سات دہائیوں سے قائم اس توازن کے خاتمے سے پورے خطے میں ایک نئے اور دھماکہ خیز عہد کا آغاز ہو چکا ہے جس میں پرانے توازن کو دوبارہ بحال کرنا تو ممکن ہی نہیں رہا لیکن کسی نئے توازن کے قائم ہوجانے کے امکانات بھی مخدوش ہیں۔

کیا یہ فیصلہ پاک بھارت اتفاق رائے سے ہوا ہے؟

بھارتی ریاست کی جانب سے اچانک اس فیصلے کو مسلط کرنے سے جو غیر یقینی صورتحال پیدا ہوئی ہے اس نے مختلف قسم کی قیاس آرائیوں اور افواہوں کی گردش کے لئے ایک سازگار ماحول فراہم کیا ہے۔ ان افواہوں کے پھیلنے کے پیچھے جو چیز قوت محرکہ بن رہی ہے وہ کشمیر پر قابض دونوں سامراجی ریاستوں کے باہمی تعلقات کا ماضی ہے جس کے دوران یہ تاثر پختہ یقین میں تبدیل ہو چکا تھا کہ کشمیر کے مستقبل کا جو بھی فیصلہ ہوگا وہ ان دونوں ممالک کے حکمران طبقات کے درمیان کسی اتفاق رائے کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ کشمیری عوام تو اپنی تمام تر جدوجہد اور قربانیوں کے باوجود ان سامراجی حکمرانوں سے خود کو اس مسئلے کا سب سے بنیادی فریق ہونا ہی نہیں تسلیم کرا سکے تھے۔ اس بنیاد پر بھارتی حکمرانوں کے موجودہ فیصلے میں پس پردہ پاکستانی حکمرانوں کی رضامندی کے شامل ہونے کو خارج از امکان قرار دینے کو زیادہ تر سیاسی و سماجی حلقے تسلیم نہیں کرتے۔ گزشتہ چند ماہ کے دوران ہونے والے کچھ واقعات کی کڑیوں کو جوڑ کر پاکستانی حکمران طبقات کی رضامندی کے حوالے سے مختلف قیاس آرائیوں کا ایک پورا سلسلہ گردش میں ہے۔ پاکستانی وزیر اعظم اور عسکری قیادت کے حالیہ دورہ امریکہ کے بعد جب ٹرمپ نے مسئلہ کشمیر پر ثالثی کرنے کا اعلان کیا تو پاکستانی حکمران طبقات اور ذرائع ابلاغ نے اس کو اپنی تاریخ کی سب سے بڑی سفارتی کامیابی بنا کر پیش کیا۔ جبکہ ہندوستان کے حکومتی ذرائع نے اس پیش کش کو اس قدر درشتی (تیزی) سے رد کیا کہ ٹرمپ کو بھی اپنی پیشکش کو ہندوستان کی رضامندی سے مشروط قرار دینا جیسی وضاحت کرنی پڑی۔ اگر پاکستانی حکمرانوں کی سفارتی کامیابی کے اعلان اور ٹرمپ کی ثالثی کی پیشکش کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان کے موجودہ فیصلے کو دیکھا جائے تو بظاہر یوں لگتا ہے کہ ہندوستان نے تمام عالمی سفارتکاری، اقوام متحدہ کی قراردادوں اور ہر قسم کے ضابطوں کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کر لیا ہے اور عالمی سامراجی طاقتوں سمیت پاکستان کے حکمرانوں کو اس کی پیشگی اطلاع بھی نہیں دی گئی۔ اگرچہ گزشتہ چند روز کے دوران بھارتی مقبوضہ کشمیر میں ہزاروں کی تعداد میں اضافی فوج کی تعیناتی اور پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے وادی نیلم کے علاقوں میں کی جانے والی اندھادھند فائرنگ جیسے واقعات کسی غیر معمولی واقعے کے رونما ہونے کی جانب اشارہ ضرور کر رہے تھے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کی اس سال کے انتخابات کی مہم کے دوران بھی یہ ایک اہم نعرہ تھا کہ وہ حکومت میں آنے کے بعد کشمیر کی خصوصی حیثیت کا خاتمہ کریں گے جبکہ اسی دوران پاکستانی وزیر اعظم عمران خان نے ایک بیان میں یہ کہا تھا کہ اگر مودی انتخابات جیت جاتا ہے تو کشمیر کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ دی پرنٹ نامی ویب سائیٹ پر 5 اگست کو شائع ہونے والے نایانیما باسو کے ایک مضمون کا عنوان ہی

اس امر کی وضاحت کے لئے کافی ہے کہ ہندوستان نے اس فیصلے سے قبل تمام ضروری سفارتکاری کا عمل مکمل کر لیا تھا۔"مودی نے گزشتہ ہفتے کے دوران اور فروری میں آرٹیکل 370 کو ختم کرنے کے اپنے منصوبے کے بارے میں امریکہ کو بتا دیا تھا" کے عنوان سے شائع ہونے والے اس مضمون میں باسو لکھتا ہے" مختلف ذرائع نے پرنٹ کو بتایا کہ امور خارجہ کے وزیر جے شنکر نے اپنے امریکی ہم منصب سیکرٹری آف اسٹیٹ مائیک پومپیو کو مودی حکومت کے آرٹیکل 370 اور 35A کے خاتمے کے منصوبے کے بارے میں آگاہ کیا۔تاہم ذرائع کے مطابق، یہ پہلا موقع نہیں تھا جب امریکہ کو اس کے بارے میں مطلع کیا گیا بلکہ فروری میں پلوامہ حملے کے دو روز بعد مشیر برائے قومی دفاع اجیت دوول نے اپنے امریکی ہم منصب جان بولٹن کو ٹیلی فون پر اسی منصوبے کے بارے میں مطلع کیا تھا" اسی مضمون میں باسو مزید لکھتا ہے"ذرائع کے مطابق مودی حکومت امریکہ کو ناراض کرنے کی بالکل بھی متحمل نہیں ہو سکتی اور اسی لئے ٹرمپ انتظامیہ کی حمایت برقرار رکھنے کے تمام ضروری و حفاظتی اقدامات کئے جا چکے تھے۔" اس مضمون کے مطابق سوموار کو وزارت خارجہ نے امریکہ، روس، چین، فرانس اور برطانیہ کے علاوہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے تمام 15 ارکان کے نمائندوں کو اس بارے میں آگاہ کیا۔یہ تفصیلات اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ جتنا بظاہر یہ فیصلہ اچانک اور یکطرفہ نظر آتا ہے اصل صورتحال اس سے یکسر مختلف ہے اور خاص کر ہندوستانی حکمران طبقات نے اہم عالمی سامراجی طاقتوں کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔دوسری جانب پاکستانی حکمرانوں کی سفارتی کامیابیوں کی بڑھک بازی اس فیصلے کی روشنی میں انتہائی مضحکہ خیز ہو کر رہ گئی ہے اور پاکستان کی عالمی سفارتکاری میں حیثیت اور مقام بھی واضح ہو رہا ہے۔اگر اس فیصلے سے امریکی حکمرانوں کے پہلے سے باخبر ہونے کو درست مان لیا جائے تو پاکستان کی عسکری و سیاسی قیادت کے امریکی دورے اور ٹرمپ کے ثالثی کی پیشکش کرنے والے بیان سے یہ شکوک جنم لیتے ہیں کہ یا تو امریکی حکمرانوں نے پاکستانی حکمرانوں کو دھوکہ دیا ہے یا پاکستانی حکمران پس پردہ کشمیر کا سودا کر آئے ہیں۔لیکن پاکستانی حکمران طبقات کی پس پردہ اس منصوبے میں شامل ہونے یا نہ ہونے کی بحث سے زیادہ اہمیت کا حامل سوال یہ ہے کہ اس فیصلے سے جنم لینے والی نئی صورتحال اور تبدیلی کے عمل کی وضاحت کرنے کی کوشش کی جائے۔

(باقی آئندہ قسط میں)

اعلان تقرری

محترم ثناء اللہ ولد نظام دین تحصیل بھوانہ ڈسٹرک چنیوٹ کی تقرری بطور بیورو چیف وسطی پنجاب لاہور انٹرنیشنل لندن برائے سال یکم جولائی تا 30 جون 2022 کی تقرری عمل میں لائی جارہی۔جو کہ ہمارے لئے صد افتخار ہے تمام سرکاری وغیر سرکاری ادارے نوٹ فرما لیں اور تعاون کی درخواست ہے۔

موصوف کا مختصراً تعارف یہ ہے کہ انجمن طالباء اسلام ڈسٹرک چنیوٹ رہے اور آجکل حکمران جماعت PTI چنیوٹ کے میڈیا سیل کے انچارج ہیں۔علاوہ ازیں اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان باہمت شخصیت کے مالک ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی تقرری تمام احباب کے لئے مبارک ہو۔آمین

محی الدین عباسی

چیف ایڈیٹر لاہور انٹرنیشنل لندن

Lahore International Magazine

Instagram: @lahoreintl
Twitter: @lahoreintl
Facebook: lahoreinternational
YouTube: lahoreinternational
Google+: lahoreintl
Contact: +447940077825
Whatsapp: +447940077825
Email: lahoreintlondon@gmail.com

شعبہ پاکستان

منافقت سے چھٹکارا

تحریر: جمیل احمد بٹ

چھ جون 2020ء کے روزنامہ جنگ میں ایک کالم بعنوان 'پاکستان کا مسئلہ نمبرون' شائع ہوا ہے جس میں کالم نگار نے تحریر فرمایا ہے کہ:

'ہم اس وقت ہر طرح کی ذلّتوں کا شکار ہو رہے ہیں'۔ اور یہ سوال اٹھایا ہے کہ 'یہ پیارا وطن روز بروز زوال اور انحطاط کی طرف کیوں جا رہا ہے؟'

انہوں نے اس کی وجہ منافقت فرمائی ہے۔ اور اس کی تائید میں مزید لکھا ہے کہ 'پاکستان میں ہر طبقے میں خیانت کی وبا آخری حدوں تک سرایت کر چکی ہے'۔ 'پاکستانی قوم کو بغیر کسی تامّل کے دنیا کی سب سے زیادہ جھوٹی قوم قرار دیا جاسکتا ہے'۔ 'وعدہ خلافی تو اس قوم کا طرّہ امتیاز بن گیا ہے'۔ 'پہلے تو عوامی سطح پر یہ وبا (گالم گلوچ) عام تھی اس وبا نے سیاست اور میڈیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے'۔ 'اس وقت ہم اس ملک میں ایک طرف ایسے ایسے مظالم دیکھ رہے ہیں کہ انسان تو کیا وحشیوں سے بھی اس کی توقع نہیں کی جاسکتی لیکن دوسری طرف ہم بزدل ترین اور خوشامدی قوم بن گئے ہیں'۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ منافقت باطن کا ظاہر کے مطابق نہ ہونا ہے۔ کیا یہ پھیلی ہوئی منافقت آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کے مطابق نہیں کہ 'وہ زمانہ آتا ہے کہ اسلام کا محض نام باقی رہ جائے گا اور قرآن کے محض الفاظ رہ جائیں گے۔ اس زمانے کے لوگوں کی مساجد بظاہر تو آباد ہوں گی مگر ہدایت سے خالی ہوں گی۔ اور ان کے علما آسمان کے نیچے بدترین مخلوق ہوں گے ان سے ہی فتنہ پیدا ہوگا اور ان ہی میں لوٹ جائے گا'۔

(ترجمہ از مشکوٰۃ کتاب العلم)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

اگر نمونہ یہود خواہی کہ بینی علماء سوء کہ طالب دنیا باشد

یعنی اگر یہود کا نمونہ دیکھنا ہو تو علماء سوء کو دیکھ لو جو دنیا کے پیچھے پڑ چکے ہیں۔

(الفوز الکبیر صفحہ 10)

کالم نگار نے اس مسئلہ کا حل یہ تجویز فرمایا ہے کہ 'اس کا واحد راستہ بس یہی ہے کہ لوگوں کو سچ بولنے دیجئے'۔ سوال یہ ہے کہ لوگوں کو سچ بولنے سے روک کون رہا ہے؟ کیا لوگ خود بارضا و رغبت جھوٹ نہیں بول رہے؟ یہ اسلام جو تم نے اختیار کر رکھا ہے، کیا یہی اسلام ہے جو نبی ﷺ نے سکھلایا تھا۔ کیا ہماری رفتار و گفتار اور کردار میں وہی دین ہے جو خدا نے نازل کیا تھا؟

پس اصل حل تو ترکِ منافقت ہے۔ کہ دل میں اس ایمان کو جگہ دی جائے جس کا دعویٰ زبان پر ہے۔ ایسا ہونے کا آسمانی نظام حضرت نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ 'اگر ایمان ثریا ستارے تک بھی چلا گیا تو ان (اہلِ فارس) میں سے کچھ لوگ اسے واپس لے آئیں گے'۔

(ترجمہ از بخاری کتاب التفسیر سورۃ جمعہ اور مسلم کتاب الفضائل)

یہ واقعہ سب کے سامنے ہے کہ جن لوگوں سے اس علاج سے فائدہ اٹھایا وہ پھر سے مومن ہو گئے۔ اسی ماحول میں رہتے ہوئے وہ مختلف انسان ہو گئے۔ ان کے ظاہر باطن ایک ہو گئے۔ وہ امانت دار، سچے، وعدہ کے پابند اور زبان کے پاک ہو گئے۔ اللہ کے ساتھ بندوں کے حقوق کی ادائیگی ان کا نصب العین ٹھہرا۔ دین کی عظمت اور سربلندی کے لئے اپنے اموال، اوقات، عزت اور جانوں کی قربانی ان کا طریق ہوا۔ چارسو ناانصافیوں، حق تلفیوں اور گالم گلوچ پر انہوں نے کمال صبر سے صرفِ نظر کر کے اپنے رب کے سامنے عاجزانہ دعاؤں کا راستہ اختیار کیا اور اللہ کی دی ہوئی تسکین سے مسکراتے چہروں کے ساتھ پانچ۔ چھ نسلوں سے ہر ظلم کو برداشت کرنے کی توفیق پائی۔ اس کے صلہ میں اللہ نے ان پر اپنا فضل کیا اور انہیں انعامات سے نوازا۔ انہیں خود سے تعلق میں بڑھایا۔ انہیں قبولیت دعا کی نعمت دی۔ انہیں دنیا میں ان جیسے علم و قابلیت رکھنے والے بے شمار دوسروں سے ممتاز کیا۔ انہیں اعلیٰ مناصب اور ان میں بہترین کارکردگی دکھانے کے قابل کیا۔ انہیں ملک اور قوم کے لئے سول، فوجی اور ہر دیگر میدان میں بار بار نیک نامی کمانے اور شان بڑھانے والا بنایا۔ ان لوگوں کا نیکی کی راہ پر کامیابی سے چل سکنا اور اللہ کے ہاں اس کی قبولیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ منافقت سے چھٹکارا کی اصل راہ یہی ہے۔ یہ راہ ہر شنوا کان، بینا آنکھ اور روشن دل کے لئے کھلی ہے۔

؎ آگے بڑھ کے جو اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کے ہے۔

شعبہ پاکستان

میں، ہم اور کرونا وائرس

تحریر: عبید احمد

۔کورونا وائرس اور ہمارے رویئے۔

ہمارا تعلق اس باصلاحیت قوم سے ہے جو ہر مُشکل میں ہر قسم کا ماہر بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، کہیں کوئی عمارت منہدم ہوجائے تو ماہر تعمیرات، مُلک میں کوئی تعلیمی مسئلہ ہوتو ماہر تعلیم، کسی کی فصل اچھی نا ہوتو زرعی ماہر، کوئی پُرانی عمارت نظر آجائے تو ماہر اثار قدیمہ، کسی کو قانونی مسئلہ درپیش ہوتو جناب ہم وکیل، کُچھ ایسا ہی معاملہ ہمیں تاب دیکھنے کو ملا جب پاکستان میں وبائی مرض کورونا کا پہلا مریض سامنے آیا۔ یہ بات ہے پچھلے سال کے آخر کی اور رواں سال کے آغاز کی جب ہم نے سُنا کہ چین میں ایک وائرس نے بڑے پیمانے پر حضرت انسان کو متاثر کیا ہے۔ہم نے کہا چین کا وائرس ہے جلد ہی ختم ہوجائے گا، حکومتی رویئہ بھی اس سے مختلف نا تھا دُنیا کی دیکھا دیکھی کُچھ اقدامات کئے گئے مگر چند دیگر مسائل کا سہارا لیا گیا، اپنی نالائقی کو چھپانے کے لئے غریب کے کندھے پر بندوک رکھ کر چلا دی گئی۔

لاک ڈاؤن ختم۔۔

اس وقت ملک ایک بار پھر حکومت کی نالائقی اورعوام کی بے وقوفیوں سے انتہائی ناگفتہ بہ صورتحال سے دوچار ہے جب مُلک میں یومیہ چار ہزار سے زیادہ افراد کورونا وائرس میں مبتلا ہورہے ہیں اور روزانہ پچاس سے ستر کے درمیان قیمتی جانیں حکومتی نالائقی کی نظر ہوہی ہیں۔مگر مملکت خداداد میں اب بھی ایک ایسا جنونی طبقہ ہے جو دنیا میں سینکڑوں انسانی جانوں کو نگل لینے والے اس ان دیکھے قاتل کو دنیا کی اس واحد اسلامی جمہوریہ ریاست اور اس کے ورلڈ چیمپن وزیراعظم کے خلاف ایک گہری سازش قرار دیتے ہیں۔ کُچھ لوگوں کا یہ بھی ماننا ہے کہ دُنیا میں بڑھتی آبادی کو کنٹرول کرنے کے لیے بھی یہ کورونا وائرس حضرت انسان کی اپنی تخلیق ہے۔ یہ سب ایک جانب مگر کیا ایسی سوچ رکھنے والے چند لوگوں نے اُن مسیحاؤں کے چہروں پر حفاظتی ماسک کے مُسلسل استعمال کی وجہ سے بن جانے والے نشان دیکھے ہیں؟ کیا ان میں سے کسی ایک نے بھی کورونا وائرس کی وجہ سے وینٹیلیٹر سے مصنوعی سانس لیتے اُن لوگوں کو دیکھا ہے جو زندگی اور موت کی کشمکش میں مُبتلا ہے؟ اور کیا ان لوگوں میں اتنی جُرت ہے کہ وہ کسی مریض کے گندگی سے بھرے کپڑے تبدیل کر سکتے ہوں جو کورونا وائرس کی وجہ سے بستر مرگ پر ہے؟ تو ان چند سوالوں کا جواب ہے"نہیں"۔۔۔لیکن اس کے باوجود ہم ماہر ہیں اس مرض کے اور ہم سب کُچھ جانتے ہیں۔۔۔ہم نے دیکھا کہ عیدالفطر سے چند روز قبل قومی ائیر لائن کا جہاز کراچی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر گرا، جہاز میں سوار ننانوے افراد میں سے صرف دو افراد حادثے میں محفوظ رہے، کئی خاندانوں کی عید کی خوشیاں خاک میں مل گئیں۔۔۔مگر اس حادثے نے کئی ماہرین ومبصرین کو جنم دیا۔۔ یہ واقعہ ہونا تھا کہ وہ لوگ بھی اس حادثہ کے بارے میں بولنے لگے جنھوں نے جہاز میں سفر کرنا تو کُجا شائد جہاز کو کبھی قریب سے دیکھا بھی نہیں ہوگا مگر اُنھوں نے بھی جہاز کے

گرنے کے مُحرکات پر تجزیہ شروع کر دیا۔ایسی ایسی کہانیاں تخلیق دیں کہ صاحب کمال، اور یہ سب تجزیات اپنے تک محدود نہیں رہے، سماجی رابطوں کی ویب سائٹ کا سہارا لیا گیا اور کُل عالم تک یہ موتی بکھیر دئے۔

اس بات کا یہاں ذکر بلا وجہ نہیں کیا آج ایک خاتون ڈاکٹر کا سوشل میڈیا پر پیغام سُنا جس میں اُنھوں نے یہی یا اس سے ملتے جُلتے الفاظ کا استعمال کیا۔اور بعد میں ہماری توجہ اُس عمومی رویئے کی جانب مبزول کروائی جس کا ذکر میں نے ابتدا میں کیا۔کہ یہ قوم ماہر ہے بنا پڑھے لکھے اور بنا سوچے سمجھے۔۔۔

اپنے لوگوں کی سوچ پر رحم بھی آتا ہے اور شرم بھی کہ ہم ان کے ساتھ اس مُلک میں رہتے ہیں۔رہنا تو ہے اور جائیں کہاں۔۔۔

پس کورونا نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہم پر قیامت بھی ٹوٹ جائے گی تب بھی ہم اُسے یہود کی سازش قرار دیں گے۔گُجا اس کے کہ ہم عالمی ماہرین کی بات سُنیں، نیوزی لینڈ، جرمنی، آسٹریلیا اور کورونا وائرس سے لڑنے اور کامیاب ہونے والے دیگر مُمالک کی مثالیں دیکھیں، یہ جاننے کی کوشش کریں کہ آخر ان مُمالک نے ایسا کیا کیا ہے کہ وہ کورونا وائرس کے خلاف جنگ جیت گئے۔۔۔ہماری نظر ہے تو امریکہ یا برازیل جیسے مُمالک کے حُکمرانوں پر جو پہلے تو اس جان لیوا وائرس کو ایک سازش قرار دیتے ہیں اور جب اپنے مُلک میں مرنے والوں کی تعداد سینکڑوں سے ہزاروں اور ہزاروں سے لاکھوں میں پہنچتی ہے تو راہ فرار ڈھونڈتے دکھائی دیتے ہیں۔تاریخ گواہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ خواہ کسی بھی خدائی آفت سے دوچار ہو یا کسی آنجہانی مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔۔۔ہم اس سے کوئی سبق نہیں سیکھتے۔۔ہم اس آفت سے بچ نکلنے کے بعد کبھی لال کا پی بنا کر اس میں یہ تحریر نہیں کرتے کہ آئندہ ہمارا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے بلکہ ہم ہمیشہ اپنے بڑوں کی روایات کو قائم رکھتے ہوئے ماضی کی انتظامیہ کو مورد الزام ٹھہراتے ٹھہراتے پھر ایک دن ایک نئی آفت کا شکار ہو جاتے ہیں پر کبھی بھی کوئی موثر لائحہ عمل نہیں بنا پاتے۔جناب من۔۔۔سوچنا یہ چاہیے کہ آئندہ ہمارے کن اداروں کو کیا کیا بہتری لانی چاہیے۔۔۔ہمیں اپنے لوگوں کو کن باتوں پر باشعور کرنا ضروری ہے۔۔۔سوال یہ ہے کہ کب تک ہم مملکت خداداد میں دوسروں پر انگلیاں اٹھاتے اٹھاتے اپنے کندھوں پر اپنوں کو اٹھاتے رہیں گے۔۔۔ایسے ہی متعدد سوال ہیں جو تحریر کا حصہ بن سکتے ہیں مگر کیا فائدہ سوائے شرمندگی کے کچھ ہو نہیں سکتا۔۔۔

کسی نے کیا خوب جُملہ کہا کہ"ہم نے پڑھ تو بہت لیا ہے مگر شائد سیکھا کُچھ نہیں"

انور مقصود کی پوسٹ انجوائے کریں

تبدیلی کا سفر "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ" سے شروع ہوا "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ" سے ہوتا ہوا "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ" کی طرف گامزن ھے۔

کیا "سلیکٹرز" (امپائرز) کوئی شرمندگی محسوس کر رہے ہیں یا "چیف سلیکٹر" ابھی تک اپنی پراڈکٹ پہ نازاں ہیں؟

اس تباہی و بربادی کی ذمہ دار حکومت ہے یا "کمیٹی"؟

پاکستانیوں کو مدینے کا ٹکٹ دکھا کر کُوفے میں دھکیل دیا گیا ہے۔پی ٹی آئی کو حکومت اگر 1947 میں بھی مل جاتی تب بھی اُنھوں نے یہی رونا تھا کہ انگریز پورا ملک تباہ کر گیا ہے۔سروے کے مطابق عمران خان کو تمام ترقیاتی پروجیکٹ اور بیویاں ایسی ملیں جن کا افتتاح پہلے سے ہی کوئی کر چکا تھا۔ تبدیلی کا کیڑا اب صرف ان لوگوں میں زندہ ہے جن کا جیب خرچ ابھی تک والدین یا محلے والے اٹھا رہے ہیں۔تبدیلی لوٹوں سے شروع ہوئی ہالینڈ کی سائیکل سے ہوتی ہوئی انڈوں، مرغیوں، کٹوں اور پھر IMF کی خودکشی تک پہنچ چکی ہے مزید پیش قدمی جاری ہے۔مجھے اللہ سے قوی امید ہے کہ جو مسلمان پی ٹی آئی کے فتنے سے بچ گیا وہ دجال کے فتنے سے بھی بچے گا ان شاء اللہ۔

پی ٹی آئی والوں سے بحث کر کے اپنا وقت ضائع نہ کریں یہ صرف آپ کے سامنے ڈٹے ہوتے ہیں۔اکیلے میں یہ بھی حسن نثار کی طرح خود پر لعنت بھیجتے ہیں۔ماہرین کا کہنا ہے پی ٹی آئی والوں سے بحث مت کریں اس کا اندازہ فیصل واڈا سے لگایا جا سکتا ہے۔عمران نیازی خود تو سائیکل پر دفتر نہ جا سکے لیکن عوام کو سائیکل چلانے پر مجبور کر دیا۔

روز جو 12 ارب کرپشن ہوتی تھی کیا اب بھی ہو رہی ہے؟

اگر نہیں تو آٹھ ماہ میں 2880 ارب روپے جمع ہو چکے ہیں وہ کہاں گئے؟

اختلاف اپنی جگہ لیکن یہ بات ماننی پڑے گی کہ عمران خان واقعی غریبوں کے لیے فرشتہ بن کر سامنے آیا ہے۔

وہ بھی موت کا۔

شعبہ پاکستان

غلط فہمی

تحریر: مرتضیٰ شبلی

ملک کو حال ہی میں دو بڑی غلط فہمیوں کا شکار ہونا پڑا جنہیں سلجھانے کیلئے منجھے ہوئے شرفا کو میدان میں اترنا پڑا۔ ایک غلط فہمی کا تو فوری ازالہ ہوگیا ہے جس سے مستقبل کیلئے بہتر پیش گوئی کی امید کی جاسکتی ہے۔ مبینہ اطلاعات کے مطابق ایک خاتون جسے جمہوریت کی ہمہ وقت خدمت میں مصروف ذرائع ابلاغ ایک کاروباری شخصیت کی دختر نیک اختر گردان رہے ہیں، کی اپنی غیر منکوحہ سوکن سے غلط فہمی پیدا ہوئی۔ اس کے نتیجے میں وہ آوٹ آف کنٹرول ہوگئیں اور اپنی پرائیویٹ فوج لیکر مذکورہ مونث جسے ایک 'ماڈل خاتون' کے طور پر پیش کیا جارہا ہے، کے گھر پر حملہ آور ہو گئیں۔ وہاں اس وقت مبینہ طور پر زیتون کے تیل سے جلنے والے چراغوں کی مدھم روشنی میں اعتکاف مکمل کرنے کی کامیابی میں محفل تشکر جاری تھی۔ روحانی مجلس میں اس طرح زبردستی ورود سے مزید غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں یہاں تک کہ وقوعہ کا ایک ایکشن سے بھرپور وڈیو کورونا کی طرح وائرل ہوگیا۔ دو سے ڈھائی تین مرلوں کے رہائشی کمی کمینوں تک بات پہنچ گئی تو انہوں نے اپنے عامیانہ تبصروں سے مزید غلط فہمیاں پھیلائیں جنہیں وکلا حضرات نے بحسنِ خوبی مزید جلا بخشی۔ دونوں اطراف رن سجنے ہی والا تھا اور عام حالات میں کرکٹ کا سٹہ کھیلنے والے جواری کورونا سے پیدا شدہ بیکاری کی وجہ سے اب خشکی پر ایک ممکنہ جنگ میں پیسے لگانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ حالات بغیر کسی ایڈوانس وارننگ کے اچانک ٹھیک ہوگئے۔ یہاں تک کہ 'ماڈل خاتون' نے اپنے گھر میں اعتکاف والے ماحول کو واپس لانے کی خاطر ایف آئی آر تک واپس لے لی۔ طرفین نے نامعلوم غلط فہمیوں کو موردِ الزام ٹھہرا کر اپنی تلواریں واپس میانوں میں ڈال لیں۔ اللہ بھلا کرے ان بزرگوں کا جنہیں 'کاروباری شخصیت' کے بیت المال سے لیکر ان کے کشف الحال تک کی ساری کرامتوں کا ادراک تھا اور پہلے ہی معاملے کو حساس مگر غیر سنگین قرار دیتے ہوئے اس کے عنقریب تصفیے کا عندیہ دیا تھا۔

ایک اور غلط فہمی نے بھی لوگوں کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ یومِ تکبیر کی سالگرہ پر اچانک یہ بحث چھیڑی گئی کہ ایٹمی دھماکے بالآخر کس نے کیے یا کروائے۔ کئی دوستوں نے اس پر لمبی بحثیں چھیڑیں حتیٰ کہ سابقہ حکومت کے ایک دوست جو میرے بھی بڑے بھائیوں کی طرح ہیں، نے ایک زوردار کالم لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دھماکوں کا فیصلہ ان کے غیر متنازعہ اور غیر متزلزل قائد نے اپنے صوابدیدی اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے کیا۔ اللہ تعالیٰ انگریزوں کے بنائے ہوئے ریلوے کے رجل رشید کا بھلا کرے کہ انھوں نے دھماکوں کی ذمہ داری قبول کرکے اس تاریخی مغالطے کو دور کردیا۔ ان کے بیان کے فوراً بعد میں نے خود مراقبے کی حالت میں انہیں بم کے ساتھ لگی سُتلی کو ماچس کی تیلی سے آگ لگاتے ہوئے دیکھا اور پھر دھماکے کے فوراً بعد خوشی میں جھومتے ہوئے اسی تیلی سے ایک امپورٹڈ سگار سلگاتے ہوئے اس کے دھویں کو ایٹمی دھویں میں ملاتے دیکھ لیا۔ مگر جو غلط فہمی میرے دل میں پھانس بن کر ہنوز چبھی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ آخر ان دھماکوں کا مقصد کیا تھا؟ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ چاغی کی پہاڑیوں سے اٹھنے والا سنہری گرد وغبار ابھی تھما نہیں تھا کہ کشمیر کے بارے میں یہ غلط فہمیاں پھیلائی جانے لگیں کہ کچھ بھی ہو اب یہ مسئلہ حل ہوا ہی چاہتا ہے۔ پھر راولپنڈی سے تصدیق شدہ ہماری کشمیری لیڈرشپ نے بھی اسی حکمت کے راگ کو الاپنا شروع کردیا اور وہ ہنوز گاہے گاہے اس کی بازخوانی کرتے سنائی دے رہی ہے۔ مگر اس کے بعد کارگل میں باضابطہ جنگ ہوئی جس میں دونوں طرف سے سینکڑوں فوجی مارے گئے، جنگی اور جاسوسی طیارے گرائے گئے مگر مجال ہے کہ ایٹمی ہتھیار زیر زمین اسٹورز سے برآمد ہوئے ہوں۔ گزشتہ سال بالاکوٹ میں 'کوا آپریشن' کے جواب میں دو بھارتی طیارے گرائے جانے کے باوجود نیوکلیئر جنگ کا امکان دور تک نظر نہیں آیا۔ گزشتہ سال بھارت کی جانب سے کشمیر میں ماورا آئین اقدامات سے پیدا شدہ صورتحال سے نسل کشی کی دہائیوں کے باوجود جنگ کو خارج از امکان قرار دیا گیا۔ اب جب چین اور بھارت دو ایٹمی طاقتیں لداخ میں مکوں، ڈنڈوں اور لاتوں سے لڑ رہی ہیں، ایسے حالات میں عجب نہیں کہ تلواروں اور تیروں سے لڑنے والے ارطغرل غازی لوگوں کی امیدوں کا مرکز بنتے جارہے ہیں۔

احتیاط

عدم برداشت

ڈاکٹر نصیر محمد عمرانی..

سائنس کی ترقی نے انسانی زندگی بدل کے رکھ دی ۔جب سے کمپوٹر دریافت ہوا تو اسنے ایک انقلاب برپا کردی۔کمپوٹر کا لفظ ہمارے معاشرے میں ایک محاورے کے طور پر استعمال ہونے لگا۔مثال کے طور پر کوئ قصائ سے کہے کہ بھیا ذرا جلدی کرنا تو وہ جواب دیگا کہ بھائ انسان ہوں کوئ کمپیوٹر تو نہیں ۔سہولیات دسترس میں ہونے کے بعد جہاں اس کے فائدے ہوئے وہیں کچھ ایسے پہلو بھی نظر آئے کہ اس نے معاشرے پر اچھے اثر نہیں چھوڑے ۔ پہلے پہلے سارا محلہ ایک ہی ٹی وی پر ڈرامے دیکھتے تھے اور بزرگ لوگ بیٹھکوں میں روزمرہ کے مسائل سنتے اور حل کرتے ۔لوگ اپنے اپنے مسائل سناتے اور اپنا بوجھ ہلکا کرتے ۔

آج کل تو موبائل کے آنے کے بعد محلے برادری کے لوگوں سے ملاقات تو دور کی ایک گھر کے فرد بھی ایک دوسرے کی شکل کئ روز بعد دیکھتے ہیں ۔لوگ اپنے مسائل اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔بچوں کا رزلٹ خراب آنے پر انکو مار پیٹ کر یا ڈانٹ کر جان چھڑائی جاتی ہے ۔دوسروں کی کامیابی یا ناکامی پر اپنے طور پر سر عام تبصرے کرنا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ کرنا ۔ یہ۔سب عدم برداشت کی وجہ سے ہوتا ہے۔جس طرح بیماری کے علاج اور تشخیص کے لئے وجوہات کا جاننا لازمی ہے اسی طرح لوگوں کے عدم برداشت کی وجوہات جاننا ضروری ہے تاکہ اس کو حل کر کے ایک صحت مند معاشرے کی بنیاد رکھی جائے۔عدم برداشت کے کئ بنیادی وجوہات ھیں جیسے کہ ناانصافی،حق تلفی ،اور حوصلہ شکنی ،عدم توجہ، بردباری اور تحمل مزاجی کا فقدان۔اگر بچوں کا رزلٹ خراب آئے تو ڈانٹ کر جان نہیں چھڑانی چاہئیے بلکہ ان سے پیار کے ساتھ اس کی وجوہات جاننی چاہئیے ۔ہوسکتا ہے اسکو اسکول میں کوئ مسئلہ ہو اور وہ توجہ چاہتا ہے۔اج کل ایک اور بات بھی نوٹ کی گئ ہے کہ جب کسی مسئلے پر گھر کے بزرگ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کو بدتمیزی کے ساتھ جواب دیا جاتا ھے کہ آپ کا زمانہ اور تھا یہ زمانہ اور ہے۔بزرگوں کے زمانے میں تو رواداری تحمل مزاجی اور بردباری ہر معاشرے کی کامیابی کا زینہ ہوتی تھی۔ان کے زمانے میں اساتذہ کی عزت اتنی ہوتی تھی کہ سکول تو سکول بچے شام کے اوقات میں بھی گھر سے نہیں نکلتے تھے کہ کہیں استاد نہ دیکھ لے۔گلی میں کانچے کھیلتے ہوئے بچے استاد کو دور سے آتے ہوئے دیکھ کر بھاگ جاتے تھے۔اگر ہم سب چاہتے ہیں کہ ہمارے معاشرے سے عدم برداشت ختم ہو تو اس کے لئے ضروری ہے تحمل مزاجی، بردباری، دوسروں کی مثبت رائے کا احترام اگر پسند نہ آئے تو اس کا مذاق نہیں اڑانا چاہئیے بلکہ تحمل مزاجی سے سمجھانا چاہئے۔کسی بھی مسئلے پر جھوٹ نہیں بولنا چاہیئے۔فارغ اوقات میں ترجمے کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کرنی چاہئیے۔سیرت النبی صلی اللہ علیہ وصلم کا مطالعہ کریں۔کسی بھی مسئلے کا مثبت حل یہ ہے کہ بولنے سے پہلے ہمیں ایک اصول پر عمل کرنی چاہئے اور وہ ہے احتیاط احتیاط احتیاط۔

زمانہ دوست ہو جائے تو بہت محتاط ہو جانا
کہ اس کا رنگ بدلنے میں ذرا سی دیر لگتی ہے

کوئی جب خواب دیکھو تو اُسے فوراً بھلادینا
کی نیندیں ٹوٹ جانیں میں ذرا سی دیر لگتی ہے

کسی کو دکھ دینا تو اتنا سوچ کر دینا
کسی کیا آہ لگنے میں ذرا سی دیر لگتی ہے

بہت ہی معتبر ہیں جن کو محبت راس آ جائے
کسی کو راہ بدلنے میں ذرا سی دیر لگتی ہے۔

شعبہ پاکستان

کرونا عذاب نہیں: پاکستان پر کبھی عذاب نہیں آ سکتا

تحریر: محمد فاتح ملک

سن 2005 میں جب زلزلہ آیا اور پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے ساتھ ساتھ کشمیر میں کافی جانی و مالی نقصان ہوا تو ایک دن کالج سے واپسی پر بس میں ایک مولوی صاحب کو اس بات پر دلائل دیتے ہوئے سنا کہ پاکستان پر اللہ کا عذاب کبھی نہیں آ سکتا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ زلزلہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے کہ ہم اپنے گناہوں سے توبہ کر لیں وہ غلط کہتے ہیں۔ کیونکہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمانوں پر کبھی عذاب نہیں آ سکتا۔ ہاں اللہ کی طرف سے آزمائش آ سکتی ہے۔

کافی عرصہ تک یہ بات میرے کچے ذہن میں راسخ رہی کہ پاکستان پر کبھی اللہ کا عذاب نہیں آ سکتا۔ ہر بار جب کوئی آفت آئی چاہے وہ مہنگائی کی صورت ہو یا بجلی پٹرول کے بحران کے رنگ میں۔ ذخیرہ اندوزی ہو یا حکمرانوں کے بے اعتدالیاں، ہر بار یہ سوچ کر ٹال دیا کہ ''پاکستان پر کبھی عذاب نہیں آ سکتا۔''

اس سال بھی کرونا وائرس کا شدید حملہ ہوا۔ ملک میں معاشی بحران بھی آیا۔ ٹڈی دل کا حملہ بھی ہوا ہے لیکن دل و دماغ میں یہ بات راسخ ہے کہ پاکستان پر کبھی اللہ کا عذاب نہیں آ سکتا۔ بلکہ اب تو اس بات پر یقین مزید پختہ ہو گیا ہے۔

سوشل میڈیا پر بہت سی ایسی ویڈیوز آتی ہیں کہ کرونا کیا آ گیا ہے ہم لوگ اپنی 'اوقات' دیکھانے شروع ہو گئے ہیں۔ یہ اللہ کا عذاب ہے ہمیں توبہ استغفار کرنا چاہئے اور لوگوں کی مدد کرنی چاہئے ان کو لوٹنا نہیں چاہئے۔ ان سب لوگوں کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ہماری عوام کو طعنے دینے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ کرونا وائرس ہمیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو صرف یہود و نصاریٰ، مشرکوں کو عذاب دینے آیا ہے۔ ہمارے ملک میں تو ویسے ہی کچھ دیر دیکھاوے کے لئے آیا ہے۔ اسی لئے تو ہماری عوام نے اس پر توبہ واستغفار کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بلکہ یہ وائرس تو ہمارے لئے خوشیاں اور شادمانی لایا ہے۔ اب دیکھیں! کرونا کا آغاز ہوا تو ماسک اور سینیٹائزرز بنانے والی کمپنیوں کے خوشحالی کے دن آ گئے۔ وہ کمپنیاں جنہیں کوئی پوچھتا ہی نہیں تھا انہوں نے تو مہنگائی کر کے خوب پیسہ کمایا ہی لیکن اپنے پیارے ملک میں بہت سے جعلی ماسک اور سینیٹائزرز مارکیٹ میں آ گئے اس لئے وہ لوگ بھی خوشحال ہو گئے جن کے پاس پہلے روزگار نہیں تھا۔ اس وائرس کے بہانے انہوں نے جعلی کاروبار کر کے خوب کمایا۔ اس لئے یہ وائرس ان کے لئے تو عذاب نہیں ہو سکتا۔

پھر ہسپتالوں والوں کو علم ہوا کہ اس وائرس کے شکار لوگوں کو وینٹیلائزر کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمارے ملک میں اس کی کمی ہے تو پرائیوٹ ہسپتال والے جو عوام کی 'بے لوث' خدمت کرتے ہیں انہیں بھی موقعہ ملا کہ وہ کچھ پیسہ کما لیں تو انہوں نے وینٹیلائزر کی قیمت اس حد تک بڑھا دی کہ سوائے امیر لوگوں کے اس بلا کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ جس دوا کے بارے میں علم ہوا کہ یہ کرونا کا علاج ہو سکتا ہے اس کی قیمت منٹوں میں آسمانوں کو چھونے لگی اور دوا بنانے والی کمپنی کے ساتھ ساتھ ذخیرہ اندوزوں کا بھی فائدہ ہو گیا۔ اصل میں تو ان غریب پنساریوں کا بھلا اس وباء نے ہی کیا ہے جن کی جڑی بوٹیاں مہینوں پڑی رہتی تھیں اور بکتی نہیں تھیں انہوں نے بھی دگنی چوگنی قیمت کر کے خوب دولت کمائی اور اپنی خوشحالی کے سامان کئے۔ اس بہانے ان کی جڑی بوٹیاں بھی بک گئیں اور انہوں نے پیسے بھی کما لئے۔ Pulse Oximeter جیسا عام ملنے والا آلہ بھی اس وقت کئی سو گنا مہنگا ہو چکا ہے۔ اور یہی حال ہر اس بزنس کا ہے جو کرونا سے وابستہ ہے۔ سب کے وارے نیارے ہو گئے ہیں۔ اسی لئے تو میرا ماننا ہے کہ یہ تو ہمارے ملک میں خوشحالی اور پیسہ لے کر آیا ہے۔ لوگ ایسے ہی کہتے ہیں کہ معیشت تباہ ہو رہی ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اگر ایسی ہی بات ہے تو عام عوام کا بھلا بھی تو ہونا چاہئے تھا۔ اس وباء نے عام عوام کا بھلا کیسے کیا؟ تو جناب! یہ وباء جب ہماری خوشحالی اور 'نیک اعمال' کا نتیجہ ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ عام عوام کا بھلا نہ کرے۔ اس وباء نے ایک لاکھ سے زائد لوگوں کو متاثر کیا ہے اور آگے بھی کرتی رہے گی۔ ہزاروں شفایاب ہو گئے ہیں اور ہزاروں مزید ہوں گے ۔ تو وہ سب لوگ جو عام عوام ہیں اور اس وباء سے شفایاب ہو چکے ہیں ان کے لئے خوشخبری ہے کہ وہ سب لوگ بھی لکھ پتی بن سکتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ٹھیک ہونے والوں کا پلازمہ، جس کی پہلے کوئی قیمت ہی نہ تھی، اب لاکھوں میں بک رہا ہے۔ اور مزید یہ کہ چند دن کے وقفہ کے بعد وہ اپنا پلازمہ پھر دوبارہ بھی عطیہ کر

سکتے ہیں۔ گویا عوام تو لکھ سے لکھ پتی ہونے جا رہی ہے۔ پہلے جو پلازمہ لوگ مفت عطیہ کیا کرتے تھے اس وبا کے آنے سے اس وقت اس کی قیمت لاکھوں میں ہے۔ یعنی ہر صحتیاب مریض اس ’کارِ خیر‘ میں حصہ لے سکتا ہے۔

ان سب دلائل کی بنا پر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اللہ کا ہم پر عذاب ہے؟

مزید یہ کہ کیا ہم نے اس کو عذاب سمجھ کر کچھ توبہ واستغفار کرنے کی کوشش کی؟ اگر ہوتا تو ہم ضرور کرتے۔ اس لئے وہ سب لوگ جو ہمیں ’لیکچر‘ دیتے ہیں کہ خدا کا خوف کرو یہ اللہ کی طرف سے عذاب ہے ان کو چاہئے کہ اب وہ ایسا نہ کہا کریں۔ اور ہمیں پیسہ کمانے دیں۔ یہ تو ہمارے لئے ایک خوشحالی کی نوید لے کر آیا ہے۔ یہ عذاب صرف مشرکوں، ہندووں، امریکہ بھارت، یورپ وغیرہ کے لئے ہے۔ ہماری معیشت کو کوئی خطرہ نہیں خطرہ تو یورپ وامریکہ کی معیشتوں کو ہے۔ اس لئے ہم تو ذخیرہ اندوزی بھی کریں گے، دھوکہ دہی بھی جاری رکھیں گے، جعل سازی بھی کریں گے اور پیسہ بھی کمائیں گے کیونکہ ’’پاکستان پر کبھی عذاب آ ہی نہیں سکتا۔‘‘

ایک ایمان افروز واقعہ

22 مئی کو کراچی ایرپورٹ سے چار سو میٹر کے فاصلے پے پی آئی اے ایربس طیارے کے کریش میں زندہ بچ جانے والے پنجاب بنک کے پریذیڈنٹ ظفر مسعود کی ایمان کو تازہ اور خدائے ذوالجلال کی ذات پے یقین کامل ہونے اور والدین کی دعا کا اثر موت کا ٹائم وقت مقام کا تعین ہونے کے بارے تین مختلف سچے واقعات !!!!!!

لوگوں نے اونچی اونچی آواز میں کلمہ پڑھنا شروع کر دیا‘ لوگ اللہ تعالیٰ کو بھی پکار رہے تھے اور گڑگڑا کر دعائیں بھی کر رہے تھے لیکن مجھ پر الٹا اثر ہوا۔ میں سکتے میں چلا گیا‘ مجھے اس وقت کوئی کلمہ‘ کوئی دعا یاد نہیں آ رہی تھی‘ میں بس چپ چاپ اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا‘ جہاز کریش ہوا‘ میری سیٹ جہاز سے نکلی اور میں سیٹ سمیت ہوا میں اچھلتا ہوا ایک گاڑی پر جا گرا‘ وہ گاڑی ایک وکیل صاحب کی تھی‘ وکیل صاحب سائیڈ پر کھڑے تھے جب کہ ان کی بیگم گاڑی کے اندر بیٹھی تھی‘ میں گاڑی کی چھت پر ٹک گیا‘ میرے پورے جسم میں درد ہو رہا تھا‘ وکیل صاحب نے میری سیٹ بیلٹ کھولی۔ مجھے گاڑی کی چھت سے نیچے اتارا اور مجھے لے کر ہسپتال کی طرف دوڑ پڑے یوں میں بچ گیا تاہم ظفر مسعود نے ایک حیران کن بات بتائی۔ ان کا کہنا تھا حادثے کے وقت میری والدہ نماز ظہر ادا کر رہی تھیں‘ یہ نماز میں تھیں جب انہیں میرے حادثے کی اطلاع دی گئی‘ میری والدہ نے یہ خبر سننے کے باوجود نماز جاری رکھی‘ یہ اس وقت تک سجدے میں پڑی رہیں جب تک انہیں یہ نہیں بتا دیا گیا اللہ تعالیٰ نے ظفر کو بچا لیا ہے‘ ظفر مسعود کی والدہ کا واقعہ اور سیٹ سمیت زندہ سلامت گاڑی کی چھت پر گرنا اور بروقت ایسے سمجھ دار شخص کا مل جانا جو انہیں سیدھا ہسپتال لے گیا۔ یہ واقعی حیران کن تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ جب کسی کو بچانا چاہتا ہے تو وہ ایسے شخص کو سیٹ سمیت جہاز سے باہر گرا دیتا ہے جسے مصیبت کے وقت کلمہ تک یاد نہیں آتا اور دوسری طرف جب یہ کسی کو بلانا چاہے تو یہ حافظ قرآن محمد شبیر جیسے متقی اور پرہیز گار شخص کو کارگو فلائیٹ کے ذریعے دوسرے ملک سے لا کر اس فلائیٹ میں بٹھا دیتا ہے جس کے نصیب میں منزل نہیں لکھی گئی تھی‘ ہمارا اللہ اتنا کارساز‘ اتنا طاقت ور ہے۔ آپ اب ایک تیسری کہانی بھی ملاحظہ کیجیے۔ میرے ایک دوست بھی اس فلائیٹ میں موجود تھے‘ نہایت شاندار انسان تھے‘ یہ جوانی میں کراچی کی ایک پارسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے‘ والد سخت اور تگڑے تھے‘ وہ نہیں مانے‘ والدین کی مرضی سے ان کی شادی ہوگئی‘ خاتون بہت پڑھی لکھی‘ ذہین اور خوب صورت تھیں لیکن ان کا نبھا نہ ہو سکا‘ طلاق ہوگئی‘ دوسری شادی ہوئی‘ وہ بھی کامیاب نہ ہو سکی‘ والد کا اس دوران انتقال ہو گیا‘ بیس سال بعد ان کا اسی پارسی خاتون سے رابطہ ہوا‘ وہ آج تک ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ یہ والدہ کے پاس گئے‘ اپنے بھائیوں اور بہنوں کو راضی کیا‘ فیملی ان کی ضد کے سامنے ہار گئی‘ یہ خوش ہو گئے‘ یہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی‘ فیصلہ ہوا یہ کراچی آئیں گے‘ لڑکی کی فیملی سے ملیں گے اور عید کے بعد باقاعدہ شادی ہو جائے گی‘ یہ بھی 22 مئی کو لاہور سے کراچی روانہ ہو گئے‘ وہ پارسی لڑکی جس کا انہوں نے 20 سال انتظار کیا تھا وہ انہیں پک کرنے کے لیے کراچی ائیر پورٹ آ گئی لیکن یہ کراچی پہنچ کر بھی اس تک نہ پہنچ سکے‘ یہ سب کی پہنچ سے نکل گئے۔ میں نے دو دن قبل اخبارات میں ان کی مغفرت کا اشتہار پڑھا‘ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے‘ بے شک ہم سب اپنے رب کی مہلت کے محتاج ہیں‘ یہ جب سانس ڈھیلی کر دیتا ہے تو انسان گرتے ہوئے جہاز سے بھی سیٹ سمیت سلامت نکل آتا ہے اور یہ جب سانس کھینچ لیتا ہے تو پھر ہمیں اگلی سانس کی مہلت نہیں ملتی‘ ہمارے دلوں کی دھڑکنیں ہمارے دل ہی میں منجمد ہو جاتی ہیں‘ یا اللہ تیرا کرم ہے‘ یا اللہ تیرا رحم ہے۔۔

پاکستان میں موجود دنیا کی سب سے بڑی ریلوے ٹنل کی حیرت انگیز داستان

کوئٹہ سے ایک سو تیرہ کلومیٹر دور ایک پہاڑی سلسلہ ہے جسے خواجہ عمران کا پہاڑی سلسلہ کہا جاتا ہے اس پہاڑی سلسلے میں شانزلہ اور شیلا باغ کے درمیان دنیا کی سب سے بڑی ریلوے ٹنل ہے جسے خوجک ٹنل کہتے ہیں، یہ وہی ٹنل ہے جس کی تصویر پانچ روپے کے متروک نوٹ پر ہوا کرتی تھی۔ یہ ٹنل 14 اپریل 1888ء کو تعمیر ہونا شروع ہوئی، یہ 5 کلومیٹر لمبی ہے اور اس کی تعمیر میں لگ بھگ آٹھ سو مزدور ہلاک ہوئے اور ان میں سے اکثر وہیں آس پاس دفن ہو گئے اس ٹنل میں ایک کروڑ ستانوے لاکھ چوبیس ہزار چار سو چھبیس اینٹیں لگی ہیں مزدوروں کی اول صف کھدائی کرتی جاتی جبکہ پچھلی اینٹیں لگاتی اور ان سے پچھلی صف پٹڑی بچھاتی جاتی، بھاری مشینری کا وجود نہ ہونے کی وجہ سے کھدائی کا سارا کام انسانی ہاتھوں سے ہوتا۔ اس ٹنل کی تعمیر کے لیے 80 ٹن پانی روزانہ کی بنیاد پہ صرف ہوتا، دن رات کام کرنے کے لیے چھ ہزار پانچ سو چورانوے چراغ جلتے جو پوری ٹنل کو اندر سے روشن رکھتے، مزدوروں کی ریفریشمنٹ کے لیے آج کے انڈیا کے علاقے سے مشہور زمانہ رقاصہ شیلا منگوائی گئی جو رات کو رقص کرتی اور دن کے تھکے ماندے مزدوروں کی تفریح کا کچھ سامان پیدا کیا جاتا۔

اب آیئے اس دلچسپ و عجیب ٹنل کے سب سے مزیدار پہلو کی طرف، اس ٹنل کے انجنیئر جس نے اس کا سروے کیا تھا، اس کے مطابق اگر پہاڑ کے دونوں طرف سے اس ٹنل کی کھدائی کی جائے تو 3 سال 4 ماہ اور 21 روز بعد دونوں طرف سے کھدائی کرنے والے مزدور ایک دوسرے سے آن ملیں گے۔

5 ستمبر 1891ء کو انجنیئر کے لگائے اور بتائے گئے تخمینے کے مطابق اس ٹنل نے مکمل ہونا تھا، مقررہ تاریخ نزدیک سے نزدیک آتی جا رہی تھی اور سرا نہیں مل رہا تھا، چند لوگوں نے افواہیں اڑانا شروع کر دیں کہ مزدور راستہ بھول کر راستے سے ہٹ گئے ہیں، انجنیئر نے غلط سروے کیا، ناقص منصوبہ بندی کی وجہ سے کروڑوں ڈوب جائیں گے، مگر انجنیئر پرامید تھا۔ مقررہ تاریخ کو دونوں طرف آنے والی اور بچھائی جانے والی پٹڑی کے آخری بولٹ لگنے تھے، دن بارہ بجے تک ٹنل کے اندر سے کوئی خبر نہ آئی، ساری رات بے چینی سے ٹہلتا انجنیئر اب بھی ٹہل رہا تھا، اسے لگا کہ آج اس کا علم اسے دھوکا دے گیا، آج اس کا سب سے بڑا خواب پورا ہونے کی بجائے ریزہ ریزہ ہو رہا تھا، انجنیئر چپکے سے اٹھا اور پہاڑی کے اوپر اس مقام پر جا پہنچا جہاں پر رات کو شیلا رقص کرتی تھی، وہاں پہنچ کے رکا چند لمحے ٹنل کے دھانے پر نظر ڈالی اور پہاڑی کی چوٹی سے گہری کھائی میں چھلانگ لگا دی، اور تقریبا'' عین اسی وقت دونوں طرف سے کھدائی کرتے ایک دوسرے کی طرف بڑھتے مزوروں کے درمیان ریت کی آخری دیوار بھی گر گئی۔

دنیا کی سب سے بڑی خوجک ٹنل مکمل ہو گئی، دونوں طرف کے مزدوروں نے ایک دوسرے سے گلے ملنے کے بعد اپنی اپنی مخالف سمت میں دوڑ لگا دی اور نعرے لگاتے چیختے چلاتے اڑھائی اڑھائی کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ٹنل سے باہر نکلے دونوں طرف جشن کا سماں برپا ہو گیا، معاً کسی کو انجنیئر کا خیال آیا اور جب تلاش کی گئی تو انجینئر غائب، کافی دیر بعد کسی نے کھائی میں کسی انسانی نعش کی نشاندہی کی اور جب دیکھا گیا تو وہ وہی انجنیئر تھا جس نے دنیا کی سب سے بڑی ٹنل کا سروے کیا اور اس کی فزیبلٹی تیار کی اور مقررہ مدت تک اپنی کمٹمنٹ پوری نہ ہونے کی صورت میں ندامت سے بچنے کے لیے پہاڑ کی چوٹی پر سے چھلانگ لگا دی٭ تاریخ میں اس جیسے کئی واقعات ملیں گے مگر تمام کے تمام "کافروں" کے ہاں، اگر آج کے پاکستانی حکمران یا ذمہ داران ہوتے تو یقیناً درمیان میں ہی چھوڑ کر کس نئی طرف سے شروع کرا دیتے اور اگر پھر بھی کامیاب نہ ہوتے تو پہاڑ سے چھلانگ لگانا تو دور کی بات آنکھیں تک نیچی نہ کرتے، اپنے ملک میں بڑی سے بڑی آفت، مصیبت یا حادثے پے ذمہ داران یوں بغلیں جھاڑ دیتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں؟ (ازمنقول)

5 جولائی مارشل لا اور پاکستان

تحریر: حسن مجتبیٰ

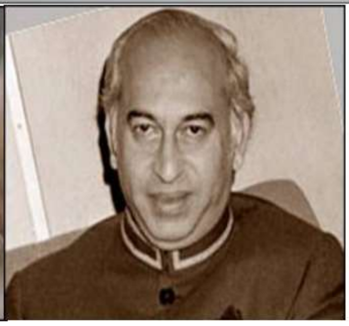

پاکستان کے کسی بھی آرمی چیف کے سر پر پورے کی پوری 'تاج کمپنی' رکھ کر پوچھا جائے کہ کیا وہ ملک پر کبھی مارشل لا نہیں نافذ نہیں کرے گا، کبھی منتخب حکومت کا تختہ نہیں الٹے گا اور اگر اس کا جواب اثبات میں بھی ہو تو یہی فرض کیا جانا چاہیے کہ وہ سچ نہیں جھوٹ بول رہا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے آخری دنوں میں جب ان کے خلاف قومی اتحاد کی پرتشدد تحریک زوروں پر تھی تو پاکستانی مسلح افواج کے سربراہوں نے ضیاالحق سمیت حلفیہ بیان دیا تھا کہ فوج منتخب حکومت اور اپنے سپریم کمانڈر اور وزیراعظم کے ساتھ وفادار رہے گی اور ہر حالت میں آئین کی حفاظت کرے گی لیکن اس کے الٹ ہوا۔ یعنی: عزیز ہم وطنو! اسلام علیکم۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو پاکستان میں پانچ جولائی کبھی ختم نہیں ہوا۔ حکومتیں فوجی ہوں، نیم فوجی ہوں کہ سویلین، کون کہتا ہے کہ مارشل لا کبھی پاکستان سے ختم ہوا ہے؟ ضیا اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے؟ فیقا کے کارٹون اب بھی اس ڈکٹیٹر سے لڑ رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پانچ جولائی ایک دھڑکے کے ساتھ دل سے چپک کر رہ گئی ہے۔ کان ہیں کہ شاہراہ دستور اور ٹرپل ون بریگیڈ کے درمیان بھاری بھرکم بوٹوں کی دھمک پر لگے ہوتے ہیں۔ شاہراہ دستور پر ٹرپل ون بریگیڈ کو آتے کتنی دیر لگتی ہے! لیکن ملک خدا حافظ سے اللہ حافظ میں بدلتے ایسا لگتا ہے کہ صدیوں پیچھے چلا گیا ہے۔ پانچ جولائی کی شب یہی ہوا تھا۔ جنرل ضیا نے ایک بار ذوالفقار علی بھٹو کو ان کے ملٹری سکریٹری کے دفتر میں اچانک آتے دیکھ کر اپنی سلگتی سگریٹ کوٹ کی جیب میں ڈال لی تھی اور جب بھٹو ان کے ساتھ بات کرتے ہوئے چلنے لگے اور ان کے کوٹ سے دھواں اٹھنے لگا تھا تو وہ بوکھلا گئے۔ بعد میں ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے ملازم سے کہا تھا کہ 'ایسا بزدل جنرل محاذ پر کیا کرے گا؟' لیکن اسی جنرل نے پورے ملک کو ایک محاذ اور میدان جنگ میں بدل دیا جو اس کے بعد آج تک کھنڈر بنا ہوا ہے۔ وہ ملک کے لوگوں کو پھر سے پاکستانی اور مسلمان بنانے آ گیا تھا' گلی محلوں میں صلوٰۃ کمیٹیاں اور اسلامی نظریاتی کونسل سے رویت ہلال کمیٹی تک ملک کو نئی فسطائیت کے جال میں جکڑ لیا گیا۔ مصنف و محقق احمد سلیم نے کہیں لکھا ہے ضیاالحق جب دیال سنگھ کالج کے دورے پر آئے تو لائبریری میں ہندی اور گورمکھی کی کتابیں دیکھ کر انہوں نے ان تمام کتابوں کو کفر سمجھ کر تلف کرنے کا حکم دیا اور پھر ضیاالحق ہی کے حکم پر ہندی اور گرمکھی کی سینکڑوں کتابیں دیال سنگھ کالج کے قریبی گندے نالے میں پھینک دی گئی تھیں۔ ضیا نے واقعی ملک پاکستان میں، بقول فیض 'گھٹا ٹوپ بے انت راتوں کے سائے' بانٹ دیے جن کا فیض اب بھی جاری ہے۔ ضیاالحق کا دور اگر پاکستان میں ایک بلیک اینڈ وائٹ ہارر فلم تھا تو پرویز مشرف رنگین شرطیہ نئی کاپی۔ ان کی لڑائی جمالیات سے لے کر فن تک اور سیاسیات سے لے کر سائنس تک ہر چیز سے تھی۔ وہ صحیح معنوں میں سماج دشمن عنصر تھا۔ اس نے پاکستان کا جس قدر بے انت حلیہ بگاڑا اور جس نوع کا جبر مسلط کیا اس کی تاریخ محمد حنیف نے بڑی جادوئی حقیقت نگاری سے فکشن کی صورت اپنے ناول 'اے کیس آف ایکسپلوڈنگ مینگوز' میں بیان کی ہے۔ بھٹو کو پھانسی دینے والے جج ضرور پنجابی تھے لیکن اس کے دور میں اندھی لڑکی کو کوڑوں کی سزا دینے والا جج سندھی تھا۔ یا وہ اے ایس آئی پولیس جو زبردست چرسی کے طور پر معروف اور اپنے کام کا اتنا ماہر تھا کہ ملٹری کورٹ کے کرنل کو اس کی منہ مانگی رشوت نہ دینے پر، حیدرآباد میں آٹے کے تاجر کالے خان پر بلیک مارکیٹنگ کا کیس بنانے کے لیے بلایا گیا تھا اور پھر اسی کالے خان کو ہزاروں 'تماشائیوں' سے بھرے نیاز اسٹیڈیم میں کوڑے مارے گئے اور اس دوران لاؤڈ اسپیکر کا مائیکروفون ان کے منہ کے قریب رکھا گیا تھا اور ہر کوڑے پر ذبح ہوتے جانور جیسی چیخ پر 'تماشائی' 'اللہ اکبر' کا نعرہ لگاتے۔ یہ الگ بات کہ بعد میں شہر کے چرسیوں نے چرس کا خفیہ نام 'کالے خان' رکھ دیا تھا۔ یہی ضیاالحق جو بینظیر بھٹو کے ساتھ مجوزہ منگنی کی اجازت کے لیے لکھا گیا ایک سی ایس ایس افسر کا خط کابینہ کے اجلاس میں لے گیا تھا۔ ان دنوں میں بینظیر کے ساتھ شادی واقعی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھی۔ مجھے شک ہے کہ بینظیر کی شادی واقعی ضیا اور اس کی ایجنسیوں کی مرضی کے بغیر ہوئی ہوگی! لوگوں نے بینظیر سے منگنی کے بعد آصف علی زرداری کو دیکھ کر کہا تھا کہ ان کی مونچھیں ضیاالحق کی مونچھوں سے مماثلت رکھتی ہیں'۔ ان کی موت پر بینظیر بھٹو نے کہا تھا کہ 'ہم میں سے نہ جانے کتنوں کے سروں پر سے موت ٹل گئی'۔ لیکن بینظیر غلط تھی۔ وہ دیگ جو ضیاالحق نے چڑھائی تھی اس کا ڈھکنا مشرف نے آ کر کھولا۔ (بشکریہ بی بی سی)

شعبہ پاکستان

پاکستان کا "مسئلہ قادیانیت" کیا ہے اور اس کا حل

تحریر: ابن قدسی

پاکستان میں وقتاً فوقتاً "مسئلہ قادیانیت" کی گونج سنائی دیتی رہتی ہے۔ قادیانی لابی، قادیانی نواز، قادیانیت غرض مختلف پیرائے سے یہ صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔ پاکستان کی نئی نسل کو صحیح رنگ میں اس مسئلہ کا علم نہیں ہوگا۔ یہ ایک مذہبی مسئلہ تھا لیکن جب سے ایوانوں نے اس "مسئلہ" کو حل کیا ہے اس کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا ہے۔ اور ہر کوئی اس کو اپنے طریق سے استعمال کرنے اور اس سے اپنے مقاصد حاصل کرنے کی رو میں بہہ نکلا ہے۔ اب تو اس کی بازگزشت مسجدوں، ایوانوں سے نکل کر سڑکوں گلی محلوں میں سنائی دیتی ہے۔ بڑی مشکل اور تگ ودو کے بعد عوام کو "تیار" کر لیا گیا ہے جب بھی "قادیانی" نام سنو تو کوئی دلیل اور بحث نہیں کرنی بس نفرت ہی نفرت کرنی ہے۔ اور یہ اسی نفرت کا ثمرہ ہے کہ برداشت کا فقدان ہو گیا ہے۔ بعض اوقات تو اتنی نفرت دیکھنے کو ملتی ہے کہ انسانیت بھی شرمندہ ہو جاتی ہے۔ آخر کس طرف جا رہے ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ مذہب کی محبت میں نفرت کا "کاروبار" مذہبی تاریخ میں کبھی بھی فائدہ مند نہیں ہوا۔ اس سے ہمیشہ نقصان ہی ہوتا ہے بلکہ محبت اور الفت ہی دلوں کو جوڑنے اور ملانے کا باعث بنتی ہے۔ نرمی تو ایک رحمت ہے تند خوئی اور سخت دلی تو وحدت کا شیرازہ بکھیر دیتی ہے۔ رسول کریم ﷺ کے متعلق قرآن کریم میں آیا ہے کہ

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ (آل عمران: 160)

یعنی پس اللہ کی خاص رحمت کی وجہ سے تُو ان کے لئے نرم ہو گیا اور اگر تُو تند خو (اور) سخت دل ہوتا تو وہ ضرور تیرے گرد سے دُور بھاگ جاتے پس ان سے درگزر کر

اگر رحمۃ للعالمین نے اپنی نرمی سے وحدت کو قائم کیا تو پھر نفرت اور درشتگی کیسے سود مند ہے۔ افسوس اس وقت ہوتا ہے جب منافرت کا رویہ مذہبی حلقوں کے ساتھ ساتھ سیاسی عمائدین کی طرف سے بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ مذہبی عقائد میں اختلاف کی بنیاد پر بحثیں ہو سکتی ہیں۔ سیاسی نظریات میں اختلاف بھی تو معاشرہ کا حصہ ہے لیکن اس پر بندوقیں اور لاٹھیاں نکل آئیں تو پھر تہذیب اپنا بوریا بستر باندھ کر ایسی رخصت ہوتی ہے پلٹ کر واپس نہیں آتی جب تک رویہ میں تبدیلی نہ ہو۔ مذہبی عقائد پر دلائل کا تبادلہ مذہبی تاریخ کا حصہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے بحثوں کا آغاز ہوا۔ انسانیت کی تخلیق پر فرشتوں کی طرف سے سوال کہ کیوں آدم کی پیدائش کی گئی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب دیا۔ صرف اکیلا جواب ہی نہیں دیا بلکہ باقاعدہ ثبوت بھی مہیا کیے حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء سکھا کر بتایا کہ ان اسماء کا علم حضرت آدم علیہ السلام کو ہوگا۔ حکم ملنے پر ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ اپنی بڑائی بیان کی۔ اپنے تکبر کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہوا پھر بھی اسے قیامت تک مہلت ملی کہ جو کرنا ہے کر۔ آخر کار انجام برا ہی ہوگا۔

پھر حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے ہابیل اور قابیل کی بحث بھی قرآن کریم میں مذکور ہے۔ وہ بھی ایک مذہبی بحث ہی تھی۔ ہابیل کی قربانی قبول کر لی گئی جبکہ قابیل کی قربانی قبول نہ کی گئی تو قابیل نے تھوڑی سی بحث کے بعد کہ اس کی قربانی کیوں قبول نہیں کی گئی، اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔ قتل کے بعد اللہ تعالیٰ نے کوّے کی ذریعہ اس کو تہذیب سکھائی کہ کیسے اپنے بھائی کو دفن کرنا ہے۔ اس پر قابیل کو افسوس ہوا کہ میرے اندر اتنی بھی عقل نہیں جتنی اس کوّے میں ہے۔ گویا انسانیت کے ختم ہونے کے بعد پر تشدد رویہ کا اظہار ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ تقریباً تمام انبیاء کے مخالفین کی طرف سے پر تشدد رویہ دیکھنے میں آتا ہے۔ بحثوں کا ذکر بھی ہے۔ مناظرے بھی ہوئے۔ دلائل کا تبادلہ بھی ہوتا ہے لیکن پر تشدد رویہ کی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ مخالفین انبیاء کے پاس دلائل نہیں ہوتے ہیں، علم ختم ہو جاتا ہے تو علمی گفتگو سے نالاں ہو کر انسانیت بھول جاتے ہیں۔ پھر وہ انبیاء کے بالمقابل پر تشدد رویہ اپناتے ہیں اور ہر طرح کی اذیت اور تکلیف پہنچاتے ہیں۔ یہ صرف انبیاء کی ذات تک محدود نہیں رہتے بلکہ انبیاء کے متبعین کو بھی ہر طرح کا نقصان پہنچاتے ہیں۔ جب ان کا یہ پر تشدد رویہ حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ خود ان مخالفین کو سزا دیتا ہے۔ سزا کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے لیکن نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے کبھی پانی کے طوفان سے تو کبھی زلزلہ سے، کبھی سمندر میں ڈبو کر تو کبھی مختلف قسم کی وبائیں بھیج کر۔ کبھی آسمانی آفات سے تو کبھی مومنوں کو کامیابیاں دے کر۔ غرض مخالفین انبیاء اپنی مرضی سے پر تشدد رویہ اپناتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی اپنی مرضی سے عذاب نازل کرتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآن کریم نے تمام

انبیاء کے حالات، ان کی مخالفت اور مخالفین کے انجام کے واقعات صرف ماضی کے قصہ کے طور پر بیان کیے ہیں اور ان کو پڑھ کر آگے گزر جانا ہے یا ان کا ہماری دنیوی زندگی سے کوئی تعلق بھی ہے۔ کیا ہماری زندگیوں میں کبھی ایسے حالات آئیں گے کہ ان واقعات کو پڑھ کر ہم کوئی نصیحت حاصل کریں، کوئی لائحہ عمل بنا سکیں۔ کبھی ہماری زندگی میں کوئی ایسا موقع آئے گا جب نبی کی پیروی اور نبی کی مخالفت ان دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے اور ان تمام مواقع پر ایک لمحہ کے لیے رک کر سوچیں کہ ہمارا شمار کس گروہ میں ہو رہا ہے۔ قرآن کریم سے پتا چلتا ہے کہ کامیاب نبی اور نبی کے متبعین ہی ہوتے ہیں اور مخالفین ہمیشہ ناکام و نامراد ہوتے ہیں تو اس لیے ہمیں ہمیشہ نبی کے متبعین میں ہی شامل ہونا چاہیے۔ اگر اس نصیحت کا حصول مقصود نہیں تو پھر قرآن کریم میں انبیاء کے حالات اور ان کے مخالفین کی مخالفت و انجام کے تذکرہ کی وجہ کیا ہے۔

اب آتے ہیں "مسئلہ قادیانیت" پر۔ یہ ہے کیا اور پاکستان میں قادیانیت مسئلہ پیدا کب ہوا؟ پاکستان بننے کے دو تین سال بعد ہی احمدیوں کے خلاف پر تشدد رویہ کا آغاز ہو جاتا ہے۔ 1953ء کے فسادات ہوتے ہیں۔ لاہور میں پہلا مارشل لاء لگتا ہے۔ بعد میں ان تمام احوال کی حقیقت جاننے کے لیے حکومت پاکستان ایک کمیشن بناتی ہے۔ اس کی رپورٹ "منیر انکوائری رپورٹ" کے نام سے شائع شدہ ہے۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمام فسادات مرکزی حکومت کو کمزور کرنے کے لیے صوبائی حکومت کی طرف سے بنائے گئے سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت ہوئے تھے۔ آج بھی وہ رپورٹ الماریوں کا حصہ ہے۔ ان ذمہ داران کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اس کے بعد سے آج تک احمدیوں کے خلاف رویہ پر تشدد ہی رہا ہے۔ پاکستان میں جب پہلی دفعہ 1953ء میں "قادیانیت" کے نام کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا تو اس وقت سے لے کر اب تک ہو رہا ہے۔ تاریخ ہمیں سبق سکھانے کے لیے ہوتی ہے اگر نہیں سیکھیں گے تو تاریخ اپنی جگہ قائم ہے لیکن اصلیت سامنے نہ آنے سے حالات بہتری کی طرف نہیں جائیں گے۔

1974ء میں اس "مسئلہ" کا سیاسی اور آئینی حل کیا گیا لیکن ایک مذہبی "مسئلہ" کا سیاسی اور آئینی حل تو اصل حل نہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے کسی کو سر درد ہو لیکن علاج بخار کا کیا جائے۔ سر درد کا علاج سر درد کی دوائی سے اور بخار کا علاج بخار کی دوائی سے ہوتا ہے۔ اس "مسئلہ" کا حل تو مذہب تعلیمات کی روشنی میں کرنا چاہیے تھے۔ لیکن فیصلہ کرتے ہوئے مذہبی تعلیمات کو یکسر فراموش کر دیا گیا۔ ایک ملک کی جمہوریت نے اکثریت کے زعم میں ایک گروہ کو اپنی مرضی کا مذہب اختیار کرنے پر پابندی لگاتے ہوئے انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ اکثریت کی بات کو مانیں اور اپنے لیے اکثریت کی مرضی کا مذہب اختیار کریں۔ پھر اس کے لیے پر تشدد رویہ کی راہ ہموار کی گئی۔ یہ زور زبردستی تو مخالفین انبیاء کرتے ہیں۔ انبیاء کے ماننے والے تو جبر اور تشدد برداشت کرتے ہیں۔ مذہبی تاریخ میں سچ کی پہچان کے لیے اکثریت اور اقلیت کی بنیاد پر فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ قرآن کریم کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ انبیاء کے متبعین تو اقلیت میں ہوتے ہیں اور مخالفین انبیاء اکثریت میں اور اسی اکثریت کے زعم میں بھر پور مخالفت کرتے ہیں لیکن کامیابی ان کے مقدر میں نہیں ہوتی۔ جماعت احمدیہ ایک مذہبی جماعت ہے۔ انہوں نے کبھی بھی اپنے آپ کو سیاسی جماعت نہیں کہا۔ مذہب سے تعلق کی بنا پر تمام تر عقائد و نظریات کی بنیاد مذہبی تعلیمات پر ہے۔ اپنا عقیدہ یا نظریہ منوانے کے لیے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کی دلیل مضبوط ہو دل اسی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس لیے جماعت احمدیہ کے مخالفین نے بجائے دلائل دینے کے اکثریت کے زعم میں تشدد کا راستہ اپنایا تو صاف اور سیدھا مطلب یہی ہے کہ مخالفین احمدیت کے پاس دلائل نہیں ہیں اسی لیے اس طرح کا رویہ اپنائے ہوئے ہیں۔

جماعت احمدیہ کا کہنا یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کی پیشگوئی کے مطابق جس فرد نے اس امت میں آنا تھا وہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ الصلوۃ والسلام ہیں۔ پیشگوئی میں مذکور ہے کہ آنے والا نبی بھی ہوگا اور امام بھی ہوگا۔ دیگر مسلمانوں کا کہنا ہے کہ جس نے نبی کے طور پر آنا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جو زندہ جسم سمیت آسمان پر بیٹھے ہیں۔ اور امام مہدی نے اسی امت میں ہونا ہے۔ جماعت احمدیہ قرآن وحدیث کے دلائل سے ثابت کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو فوت ہو چکے ہیں۔ وہ وفات کے بعد وہ کیسے دوبارہ دنیا میں آئیں گے۔ وفات کے بعد دوبارہ دنیا میں آنا صریح اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے اور نہ کبھی کوئی آیا ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ امت میں آنے والے جس فرد کی نبی کے طور پر پیشگوئی موجود ہے وہ کون ہوگا؟ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ الصلوۃ والسلام نے کہا کہ وہ امتی نبی ہیں۔ جب نبی ہو تو وہی امام ہوتا ہے۔ اب یہاں بحث طلب بات یہ ہے کہ آیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں یا وہ زندہ ہیں۔ اگر وہ زندہ ہیں تو جماعت احمدیہ کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ثابت کرنا ان علماء کا کام تھا۔ وہ دلائل سے ثابت کر دیتے کہ حضرت عیسی علیہ السلام زندہ ہیں تو مسئلہ ہی ختم تھا لیکن علماء اس بنیادی مسئلہ کو چھوڑ کر حضرت مرزا صاحب کی ذات پر حملہ کرتے ہیں یا ختم نبوت کا نعرہ لگا کر پر تشدد رویہ اپناتے ہیں۔ اب اگر ایک نبی کے آنے کی خبر رسول کریم ﷺ نے خود دی ہوئی ہے تو پھر ختم نبوت پر ڈاکہ کس طرح اور کون ڈال سکتا ہے۔ بحث تو اصل یہ ہے کہ پرانا

نبی آئے گا یا نیا۔خاتم النبین کے بعد نبی آنے کی پیشگوئی تو ہے۔جماعت احمدیہ بدل وجان رسول کریم ﷺ کو خاتم النبین مانتی ہے اور خاتم کے ہر معانی کو تسلیم کرتی ہے۔خاتم کے حقیقی معانی مہر وانگوٹھی کے ہیں۔ان معانی پر سر تسلیم خم بلکہ جو تشریح ان معانی کی روشنی میں بیان کی جاتی ہے وہ اتنی عظیم الشان ہے کہ زبان سے بے اختیار درود شریف نکلتا ہے۔نبیوں کی مہر یعنی جس طرح مہر اپنا عکس پیدا کرتی ہے اس طرح جس پر رسول کریم ﷺ کی مہر لگے گی اس میں نبیوں کے نقش پیدا ہوں گے۔مہر تصدیق کے لیے ہوتی ہے تو اب نبیوں کی تصدیق رسول کریم ﷺ کے ذریعہ ہوگی۔انگوٹھی خوبصورتی اور زینت کے لیے ہوتی ہے تو نبیوں کی خوبصورتی اور زینت رسول کریم ﷺ ہیں۔غرض لمبی تشریح ہے۔ہاں خاتم کے ایک مجازی معنی ختم کرنے کے بھی ہیں تو جہاں حقیقی معانی اتنے عظیم الشان ہوں وہاں مجازی معانی اس کے خلاف کیسے تسلیم کر لیے جائیں اور کیوں حقیقی معانی کو چھوڑا جائے۔ویسے بھی ختم کرنے والے معانی بھی قابل قبول ہیں۔نبیوں کے تمام کمالات کو ختم کرنے والے۔ان سے زیادہ کسی نبی کو کمالات نہیں ملے۔لیں ختم کرنے والے معانی بھی تسلیم کر لیے۔ویسے ایک اور مفہوم بھی ہے شرعی نبیوں کو ختم کرنے والے۔کیونکہ قرآن کریم نے اعلان کیا ہے کہ وہ آخری شریعت ہے تو یہ مجازی معانی بھی قرینہ کے ساتھ قابل قبول ہیں کہ شرعی نبی اب رسول کریم ﷺ کے بعد نہیں آئے گا۔

اب مسئلہ "قادیانیت" کو حل کرنے کا صاف سیدھا اور آسان راستہ یہی ہے کہ ان دلائل کو توڑا جائے۔اگر صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر زندہ جسم سمیت ثابت کر دیا جائے تو مسئلہ بآسانی حل ہو جاتا ہے۔لیکن یہ مسئلہ اتنا آسان لگتا نہیں کیونکہ علماء اس حوالے سے دلائل دینے کی بجائے پر تشدد رویہ اختیار کرتے ہیں تو یہی گمان ہوتا ہے کہ ان کے پاس دلائل نہیں ورنہ یہ رویہ اختیار نہ کریں۔یہ رویہ تو مخالفین انبیاء کا ہے وہ دلائل سے عاجز آ کر اپنی طاقت اور اپنی اکثریت کو استعمال کرتے ہیں جو ان کی علمی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہے اور الٰہی جماعت کی سچائی کا عملی ثبوت۔اس صورت حال میں کیسے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ایک ملک میں اکثریت اپنے ملک کی اقلیت کو تشدد کے ذریعہ ختم کر سکتی ہے۔دلائل کا توڑ تو دلائل سے ہوتا ہے۔احمدیت مذہبی تعلیمات لیے ہوئے ہے اور اپنے آپ کو سیاست سے دور رکھتے ہیں تو ان کا علاج سیاسی طریق سے کیسے ہو سکتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی اکثریت نے سیاسی اور آئینی طریقہ سے جب احمدیت کو اقلیت قرار دیا تو اس کے بعد پوری دنیا میں پھیل گئے اور وہاں کی اکثریت کو ان کے مذہبی پہلو سے کوئی سروکار نہیں بلکہ بیرونی دنیا کی سیاست اور آئین نے تحفظ دیا جس کی وجہ سے ان ممالک میں سیاسی اور آئینی طور پر زیادہ مضبوط ہوئے۔پاکستان میں انہیں سیاسی اور آئینی طور پر کمزور سے کمزور تر کرنے کی کوشش میں دیا جانے والا ہر بیان ان کو بیرونی دنیا میں مضبوط سے مضبوط تر کرتا ہے۔پاکستان میں ان کو دبا کر اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ بڑی کامیابی حاصل ہو رہی ہے لیکن یہ کوشش قادیانیت کے لیے مزید مضبوطی کا باعث بن رہی ہے۔

اس لیے مسئلہ قادیانیت کا سیاسی اور آئینی طریق سے حل کرنے کی بجائے مذہبی طریق سے حل کرنا چاہیے۔لیکن پاکستان میں تو ان کو مذہبی طور پر اظہار خیال کی آزادی ہی نہیں۔یک طرفہ باتیں ہی سننے کو ملتی ہیں۔سوشل میڈیا کی وجہ سے ان کے خیالات بھی سننے کو ملتے ہیں لیکن ان کے خیالات اور دلائل اس سے مختلف ہوتے ہیں جو پاکستان میں مذہبی حلقے بیان کرتے ہیں۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہبی حلقے دلائل کے میدان میں ان کا مقابلہ نہیں کر پاتے اسی لیے تو سیاسی اور آئینی طریق سے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس لیے سیاسی حلقوں کو سوچنا چاہیے اور سب سے پہلے اس مسئلہ کے حوالے سے سیاست کرنے پر مکمل پابندی لگانی چاہیے۔اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ مذہبی حلقے تو کیا بعض سیاسی حلقے بھی جب اپنی کسی کمزوری کو چھپانا یا سیاسی طور پر کمزور ہوں تو فوری طور پر اس "مسئلہ" کا سہارا لے کر اپنی سیاست چمکانے کی کوشش کرتے ہیں جو در پردہ "قادیانیت" کی مضبوطی کا باعث بن رہے ہوتے ہیں۔گویا اپنے فائدے کے حصول میں وہ "قادیانیت" کو فائدہ پہنچا رہے ہوتے ہیں۔اس کا مسئلہ کا حل آئینی بھی نہیں ہے کیونکہ آئین تو پاکستان کا ہے لیکن یہ "مسئلہ" تو اب عالمی بن چکا ہے۔پاکستان میں جتنا مرضی آئینی حل کر لیں رتی برابر فرق پڑنے والا نہیں بلکہ اس سے جماعت احمدیہ کو فائدہ ہوتا ہے۔اس لیے مذہبی حلقوں پر بھی اس "مسئلہ" کے حوالے سے سیاسی اور آئینی پہلو استعمال کرنے پر مکمل پابندی ہونی چاہیے۔اب رہ جاتا ہے مذہبی پہلو تو یہ کام مذہبی حلقوں کا ہے کہ وہ دلائل کے ذریعہ اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں۔نرمی کو اختیار کریں۔نرمی اور دلیل کے ساتھ بات یقیناً دلوں پر اثر کرتی ہے۔پھر یہاں ایک اور مسئلہ بھی ہے کہ احمدیوں کو بالمقابل دلائل دینے کی آزادی ہی نہیں بلکہ ان کے اظہار خیال پر پابندی ہے۔خیر موجودہ دور میں سوشل میڈیا نے کافی حد تک اس بات کو حل کر دیا ہے۔علماء اپنے دلائل بیان کریں بالمقابل دلائل بھی آ جائیں گے۔لوگ خود فیصلہ کر لیں گے کس کے دلائل مضبوط ہیں۔لڑائی کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔حکومت وقت سے درخواست ہے کہ فوری طور پر "مسئلہ قادیانیت" کے حوالے سے سیاست کرنے پر مکمل پابندی عائد کریں۔

❁❁❁

راجہ داہر کی دو بیٹیاں اور محمد بن قاسم کی موت

تحریر: ابونائل

بنوامیہ کے دور میں محمد بن قاسم کی قیادت میں عرب افواج نے سندھ پر حملہ کیا۔آخر کار راجہ داہر کی افواج کو شکست ہوئی اور سندھ عرب سلطنت کا حصہ بن گیا۔آج تک ان تاریخی واقعات کے متعلق بہت سی دلچسپ بحثیں جاری ہیں۔ ان میں سے ایک اہم واقعہ محمد بن قاسم کی موت کا ڈرامائی واقعہ ہے۔اس کے متعلق جو کہانی بیان کی جاتی ہے وہ "چچ نامہ" سے لی گئی ہے اور اس کتاب کو "فتح نامہ سندھ" بھی کہا جاتا ہے۔کوئی تبصرہ کرنے سے قبل اس کتاب میں محمد بن قاسم کی موت کے بارے میں جو واقعات لکھے ہیں ان کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

اس کتاب میں لکھا ہے کہ جب راجہ داہر جنگ میں مارے گئے تو محمد بن قاسم نے ان کی دو کنواری بیٹیوں کو حبشہ کے غلاموں کی قیادت میں بغداد بھجوا دیا تا کہ انہیں بنو امیہ کے بادشاہ ولید بن عبد الملک کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ بادشاہ نے ہدایت دی کہ انہیں چند دن آرام کرا کے ان کی خوابگاہ میں بھجوا دیا جائے۔کچھ دن کے بعد بادشاہ نے لڑکیوں کو یاد فرمایا اور ہدایت دی کہ دونوں بہنوں کو بادشاہ کی خوابگاہ میں بھجوایا جائے۔[یہ بھی خوب ہے کہ دونوں کو اکٹھا ہی بلا لیا]

بادشاہ نے خوابگاہ میں ایک ترجمان کا انتظام پہلے ہی کر رکھا تھا۔اس نے ترجمان سے پتہ کروا کے کہ بڑی بہن کون سی ہے؟ چھوٹی بہن کو اس وقت تک باہر رکنے کا کہا جب تک بڑی بہن کی باری ختم نہ ہو جائے [معذرت کتاب میں اسی طرح لکھا ہے] بڑی ہمشیرہ پردے کے اہتمام کے ساتھ بادشاہ کی خوابگاہ میں آئی تھی۔جب بادشاہ نے پردہ اتارا تو اس کی بے مثال خوبصورت شکل دیکھتے ہی فریفتہ ہو گیا۔چنانچہ بادشاہ نے شہزادی سے بے تکلف ہونا شروع کیا۔بادشاہ نے اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی تو شہزادی اچھل کر کھڑی ہو گئی اور کہا کہ بادشاہ سلامت ہمیشہ زندہ رہیں۔محمد بن قاسم نے ہمیں آپ کی خدمت میں بھجوانے سے پہلے اپنی خوابگاہ میں تین روز تک رکھا تھا۔آپ کی قوم کے بادشاہوں میں ایسی لڑکیوں سے تعلق پیدا کرنے کا رواج نہیں ہے۔یہ آپ پر ایک بدنما داغ ہوگا۔[یہ بھی غلط ہے]

بادشاہ غصے سے بھر گئے اور اسی وقت کاغذ اور قلم منگوا کر خط لکھوایا کہ محمد بن قاسم کو جانور کی کھال میں بند کر کے ان کی خدمت میں بھجوایا جائے۔اور دلچسپ بات یہ کہ یہ خط محمد بن قاسم کو ہی بھجوایا گیا اور وہ بھی اس جلدی میں کہ ان کی جگہ سندھ کا کوئی اور حکمران بھی مقرر نہیں کیا۔جب یہ خط محمد بن قاسم کو ملا تو انہوں نے حکم دیا کہ مجھے جانور کی کھال میں گھسا کر ایک صندوق میں بند کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جلد ہی محمد بن قاسم انتقال کر گئے۔جب ان کی لاش بادشاہ کی خدمت میں پیش کی گئی تو انہوں نے فخر سے محمد بن قاسم کی لاش راجہ داہر کی بیٹیوں کو

دکھائی۔ ایک شہزادی نے ایک بار پھر اپنے چہرے سے نقاب اتارا اور سجدے میں گر کر ایک لمبی تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم نے تو جھوٹ بولا تھا۔ محمد بن قاسم تو ہمارے بھائی یا بیٹے کی طرح تھا۔ یہ جھوٹ ہم نے اپنے خاندان کی بربادی کا بدلہ لینے کے لئے بولا تھا۔ یہ سن کر بادشاہ کا جلال ایک مرتبہ پھر بھڑک اٹھا اور انہوں نے حکم دیا کہ ان دونوں کو ایک دیوار میں چن دیا جائے۔ اور برطانوی حکومت کے ایک گزٹ کے مطابق یہ حکم دیا کہ ان دونوں کے کپڑے اتار کر انہیں گھوڑوں کی دم سے باندھ کر گھوڑے دوڑا دیے جائیں۔ اس طرح گھوڑے ان دونوں کی برہنہ لاشیں لے کر سڑکوں پر دوڑتے رہے۔ [ملاحظہ کیجئے انگریزی ترجمہ چچ نامہ از مرزا قلیچ بیگ فریدوں کے آخری صفحات]

یہ روایت کسی غیر معیاری فلم کی کہانی تو بن سکتی ہے لیکن اسی تاریخی طور پر درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا ثبوت کیا ہے؟

1۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ راجہ داہر کی بیٹیوں کو بغداد بھجوایا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ولید بن عبد الما لک کے عہد میں اس سلطنت کا دار الحکومت دمشق تھا۔ "تاریخ طبری" میں ولید کے سفروں کا بھی احوال لکھا ہے۔ طبری کے مطابق ولید بادشاہ ہوتے ہوئے کبھی بغداد نہیں گئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس وقت بنایا گیا جب بنو عباس کے عہد میں بغداد دار الحکومت بن گیا تھا۔

2۔ اس کتاب میں کئی خواتین کے قصے شامل کیے گئے ہیں جو کہ تاریخی طور پر غلط ہیں۔ مثال کے طور پر اس کتاب میں لکھا ہے کہ جب راجہ داہر کا سر بنو امیہ کے بادشاہ عبد الما لک بن مروان کو بھجوایا گیا تو شہزادوں اور رانوں کے بیٹیوں کو گرفتار کر کے اس سر کے ساتھ بھجوایا گیا۔ اور عبد الما لک بن مروان نے ان لڑکیوں کو دیکھنے کے بعد کہا ان میں سے راجہ داہر کی بھتیجی کون سی ہے؟ جب راجہ داہر کی بھتیجی کو سامنے لایا گیا تو بادشاہ اس کا حسن دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کہانی گھڑنے والے کو بنیادی تاریخی حقائق کا علم بھی نہیں تھا۔ کیونکہ سندھ پر حملہ 90 سے 92 ہجری میں بیان کیا جاتا ہے اور اس سے چھ سال قبل شوال 86 ہجری میں عبد الما لک بن مروان کا انتقال ہو چکا تھا۔ [تاریخ طبری اردو ترجمہ جلد چہارم]

3۔ اس کتاب میں وہ معین گفتگو بھی درج ہے جو کہ اس وقت ہوئی جب بادشاہ سلامت خلوت میں اس شہزادی سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ سمجھ نہیں آتی کہ کیا سندھ کی شہزادی نے تین چار دن میں عربی بولنا سیکھ لی تھی۔ یا شاید بادشاہ سلامت سندھی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ یا تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ترجمان صاحب کو فارغ نہیں کیا تھا اور وہ اس حالت میں بھی کمرے میں کھڑے ہو کر ترجمانی کے فرائض ادا کرتے رہے۔ یہ تاریخی واقعہ ہے یا کوئی لطیفہ۔

4۔ تاریخ طبری میں اس طریق پر محمد بن قاسم کی برطرفی اور موت کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ اور یہ کتاب چچ نامہ سے بہت زیادہ معتبر ہے۔

5۔ انگریزوں نے سندھ کے بارے میں تحقیق کر کے مختلف گزٹ شائع کیے اور ان میں اس کہانی کو لغو اور بے بنیاد قرار دیا۔ [ملاحظہ فرمائیں Gazetter of The province of Sind 1876، 1907]

6۔ جو لڑکیاں بادشاہ کی خواب گاہ میں داخل ہوئیں، چچ نامہ میں ان کے نام درج ہیں۔ لیکن جس شہزادی نے محمد بن قاسم کی لاش دیکھ کر تقریر کی اس کا نام مختلف ہے۔

گزشتہ سالوں میں پاکستان اور ہندوستان میں مختلف مصنفین نے اس قصے کو بنیاد بنا کر نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک پاکستانی اخبار میں ایک مضمون نگار نے لکھا کہ اس سے محمد بن قاسم کی کم عقلی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کو چاہیے تھا کہ سواری پر بیٹھ کر سفر کرتا اور چند کوس پہلے کسی کھال میں گھس کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ بھارت کے بہت سے جرائد میں بھی ایسے مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں اس کہانی کو درج کر کے یہ تبصرے کیے گئے ہیں کہ دیکھا ہماری شہزادی نے کیسا انتقام لیا۔ دیکھا ظالم فاتح کا کیا عبرت ناک انجام ہوا۔ میری عاجزانہ رائے میں تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے اگر "پاسبان عقل" ساتھ رہے تو بہتر ہے۔ اور کسی واقعہ سے نتیجہ اخذ کرنے سے قبل یہ جائزہ لے لینا چاہیے کہ وہ واقعہ درست بھی ہے کہ نہیں۔

لاہور انٹرنیشنل بین الاقوامی ترجمان ہے۔
ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی صورتحال کا تجزیہ تعلیم و تدریس و تربیت سے متعلق اہم مضامین کا آئینہ دار ہے۔

شعبہ پاکستان

چینی، آٹا چوروں کے بعد پیٹرول چور

تحریر: خلیل احمد نینی تال والا

گزشتہ 30 سال میں لندن میں بڑے بڑے سیاستدانوں کے محلات کا چرچا رہا ہے، سب سے پہلے متحدہ کے بانی الطاف حسین کے 10 ملین کے اجویئر علاقہ لندن میں مکان کا انکشاف ہوا۔ انہوں نے کہا کہ یہ مکان مجھے میرے چاہنے والوں نے چندہ دے کر دلایا ہے۔ بات مہاجروں کی تھی جو لندن میں آباد تھے سب نے مان لی۔ پھر سرے محل کا ذکر آیا تو بینظیر صاحبہ نے ماننے سے انکار کر دیا۔ میڈیا نیا نیا آزاد ہو رہا تھا، کچھ دل جلے لندن جا پہنچے اور بڑی بڑی تصاویر شائع کر دیں مگر کسی نے OWN نہیں کیا، صرف خبروں تک معاملہ کھلتا اور دبتا رہا اور پھر قوم نے دیکھا وہ بھی اپنی موت آپ مر گیا۔ قوم خاموشی سے تماشا دیکھتی رہی اور پی پی پی والے تردیدیں کرتے رہے۔ حالات چلتے چلتے مسلم لیگ (ن) کے دور میں داخل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، محترم نواز شریف کے لندن میں فلیٹوں کا ذکر شروع ہوا پہلے انکار پھر قطریوں کے خطوط، پھر قومی اسمبلی میں سعودیہ میں جلا وطنی کے دوران ملنے والے اسٹیل کے کارخانہ کو فروخت کر کے پیسہ لندن بھیجنے کا اعتراف، پھر صاحبزادے کا ایک ٹی وی انٹرویو میں ہامی بھرنا، پھر دوسرے صاحبزادے کا انکار، پھر صاحبزادی مریم نواز کا نیب کو انکاری بیان، پھر نواز شریف کو نااہل قرار دیا گیا تو مجھے کیوں نکالا کی تکرار سننے میں آئی۔ آج کل یہ خاندان مع اہل وعیال ایون فیلڈ کے فلیٹوں میں غربت کی زندگی گزار رہا ہے۔ نیب حسن نواز اور شہباز شریف کے ایک صاحبزادے سلمان شہباز کو عدالت میں لانے میں لگا ہوا ہے، بظاہر لندن کے قوانین کے مطابق شاید ہی نیب والے کامیاب ہو سکیں کیونکہ نواز شریف کو بھی چپ لگ چکی ہے۔ پی ٹی آئی حکومت نے صرف ایک وعدہ پورا کر دکھایا، وہ یہ کہ بڑے بڑوں کو جیل میں ڈالا، پھر نکالا اور پھر ڈالا اور اب سب ایک ایک کر کے نکل چکے ہیں۔ کچھ گھروں میں اور کچھ لندن میں مقیم ہیں اور سب چپ شاہ کا روزہ رکھے ہوئے ہیں۔ ایسے میں وقت نے کروٹ لی اور دیکھتے ہی دیکھتے آٹا چور، چینی چور، خود پی ٹی آئی میں پیدا ہوئے میڈیا کو موقع ملا لوگ ماضی کے اربوں، کھربوں کے گھپلا بازوں کو بھولنے لگے۔ نیب اب نئے گھپلے بازوں کی طرف لگ گیا سب پر ہاتھ ڈالا گیا مگر کسی ایک کو جیل جانے کی زحمت نہیں دی گئی۔ اب گھبرانا نہیں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا کا نعرۂ تبدیلی اپنی موت آپ مر گیا۔ سب ایک ایک کر کے چھوٹنے لگے کیونکہ حکومت ملنے کا ڈر لگنے لگا تھا اور جو صاحب کرامت تھے وہ اپنا جہاز پکڑ کر آج کل لندن میں اپنے دس پندرہ ایکڑ کے مکان میں سستانے اور معروف بہانہ' چیک اپ کروانے میں لگے ہوئے ہیں تاکہ اوپری آسمانی، سلطانی آفتیں ٹھہر جائیں تو وہ آئندہ کا لائحہ عمل سوچیں۔ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کسی کو نہیں چھوڑوں گا کہنے والے محترم وزیراعظم سچ کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے ابھی اپنے ان ہونہاروں کو پکڑا ابھی کب ہے، جو وہ چھوڑیں گے۔ چوہدری برادران اور سابقہ وزیر اطلاعات فردوس عاشق اعوان بھی نیب میں مطلوب ہیں مگر ابھی تک ان پر بھی ہاتھ نہیں ڈالا گیا۔

اب ایک اور نئے فتنے نے جنم لیا ہے یعنی پیٹرول حکومت نے عالمی منڈی کے گرتے داموں کی وجہ سے دام کم کیے تو پیٹرول مافیا نے فوراً اپنا کام دکھا کر پیٹرول غائب کر دیا۔ اب لوگ چینی چور، آٹا چور، حتیٰ کہ کورونا کو بھول کر پیٹرول پمپوں کی لائنوں میں بغیر ماسک پہنے لگے ہوئے ہیں۔ ایک آدھ کو جرمانہ ہو گیا جو آٹے میں نمک کے برابر ہے اور ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ یہ پہلی مافیا ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل کے سیاست دان ملوث نہیں ہیں۔ یہ بھی کورونا کی مانند آئے اور پورے ملک میں چھا گئے ہیں، بے چاری حکومت کس کس سے نمٹے وہ خود اسکینڈلوں سے نڈھال ہو چکی ہے۔ اب اسی مصیبت میں بجٹ بھی پیش ہوا۔ کہتے ہیں کوئی ٹیکس نہیں لگایا مگر حزب اختلاف جو ماضی میں اس سے زیادہ بُرے بجٹ پیش کرتی رہی ہے۔ جب کہنے کو کوئی مثبت بات نہیں ملی تو سارا غصہ سرکاری ملازمین کی تنخواہیں نہ بڑھانے پر اتار رہے ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن البتہ اپنے نیزے اور تلواروں کے زنگ اتارنے میں لگ گئے ہیں جنہیں 2 سال سے زنگ لگا ہوا ہے۔ قوم کورونا کی واپسی سے پریشان ہے۔ سیاست دان اپنے بقایا تیروں کو آزمانے کیلئے بجٹ کا سہارا تلاش کر رہے ہیں۔ حکومت کے عاقبت نا اندیش وزرا اپنی نااہلیوں سے اپنے اتحادیوں سے ناروا سلوک بھی جاری رکھے ہوئے ہوں۔ حال ہی میں بلوچستان سے تعلق رکھنے والے اختر مینگل 2 سال سے اپنے کئے گئے معاہدوں پر عمل درآمد کرانے کا واویلا کر رہے ہیں مگر پی ٹی آئی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی جب پانی سر سے اوپر جانے لگتا ہے تو وہ پھر بھاگتے ہیں اور منا کر لے آتے ہیں۔ بس یہی کام رہ گیا ہے ان کے وزرا کا، اسی کا نام تبدیلی ہے۔

جسٹس فائز عیسیٰ، پاکستان کی عدلیہ، اور اس کے لٹکتے فیصلوں کی بدنما تاریخ

تحریر: عصمت اللہ نیازی

جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کی عدالت عظمیٰ میں درخواست پر ایک درمیانی راہ اختیار کرتے ہوئے دس رکنی بینچ نے ان کے خلاف ریفریس تو ختم کر دیا لیکن ان کی اہلیہ کے ٹیکس کے معملات فیڈرل بورڈ آف ریوینو بھیج دیے گئے ہیں جہاں سے رپورٹ پھر سپریم جوڈیشل کونسل کو بھیجی جانی ہے، یعنی جسٹس فائز کے معاملہ پر ابھی سپریم جوڈیشل کونسل کی تلوار لٹک رہی ہے۔ تاہم، پاکستان بار کونسل نے اعلان کیا ہے کہ وہ اس فیصلے کے خلاف نظر ثانی کی اپیل دائر کرے گی۔ فیصلے کے آنے کے بعد سے میڈیا اور سوشل میڈیا پر عدالتی فیصلے پر ایک طویل بحث جاری ہے اور اکثر حلقے فیصلے کو تنقید کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ اسی دوران ایک پرائیویٹ ٹی وی کا ماضی کا ایک کلپ بھی نظر سے گزرا جس میں جسٹس نسیم حسن شاہ مرحوم فرما رہے ہیں کہ ’’جج پر انصاف کرنا لازم تو ہے مگر جب اپنی نوکری کا معاملہ آتا ہی تو تمام جج صاحبان اتنے بہادر نہیں ہوتے کہ اپنی نوکری کو قربان کر دیں اور انصاف کرتے رہیں، میں آپ کو سچی بات بتا رہا ہوں‘‘۔ نسیم حسن شاہ اس بنچ کا بھی حصہ تھے جس نے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی۔ اور بہادری کا خوب مظاہرہ کر کے پھانسی کے حق میں فیصلہ کرنے والوں میں شامل تھے، کیوں کہ نوکری کا جو معاملہ تھا۔ عدلیہ کی سیا※ تاریخ میں اب تو ایک طویل قطار ہے جس پر اگر ہم لکھنا شروع کریں تو شاید صفحات کم پڑ جائیں۔ چند چیدہ چیدہ فیصلوں پر نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ مولوی تمیز الدین کیس جس کا فیصلہ وفاقی عدالت (سپریم کورٹ) کے سربراہ جسٹس محمد منیر نے لکھا اور سیاہ تاریخ کا آغاز ہوا۔ 1954 میں اس وقت کے گورنر جنرل غلام محمد نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی جب توڑ دی تو مولوی تمیز الدین نے اس اقدام کو چیلنج کر دیا، جسٹس منیر نے نظریہ ضرورت کا سہارہ لیا اور گورنر جنرل کے فیصلے کو عدالتی تحفظ دیا۔ جسٹس اے آر کارنیلس واحد جج تھے جنہوں نے اسمبلی توڑنے کے فیصلے کو غیر قانونی قرار دیا۔ نظریہ ضرورت کے بارے میں طویل بحثیں موجود ہیں اور چیف جسٹس افتخار چودھری کیس میں کہا گیا کہ ہم نے اسے ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا، لیکن اس کے بعد بھی نظریہ ضرورت کے تحت بہت سے فیصلے دیے گئے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ہائی کورٹ اسمبلی توڑنے کے خلاف فیصلہ دے چکی تھی۔

2) بھٹو پھانسی کیس

ذوالفقار علی بھٹو جو پاکستان کے پہلے جمہوری طور پر منتخب وزیر اعظم تھے جنھیں جسٹس انوار الحق کی سربراہی میں سپریم کورٹ نے ایک من گھڑت کیس میں موت کی سزا سنائی اور انہیں فوجی آمر ضیاالحق کے دور میں پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا گیا۔ بعد میں بنچ کے رکن اور پھانسی کے حق میں فیصلہ دینے والے جج نسیم حسن شاہ نے تسلیم کیا کہ یہ سزا غلط دی گئی اور وہ اس غلط فیصلے میں شامل تھے۔ اس فیصلے نے ایک نیا ٹرینڈ دیا اور تقریباً ہر جمہوری طور پر منتخب وزیر اعظم کو اب تک جعلی اور گھڑے ہوئے کیسز کے ذریعے گھر بھیجنے کا سلسلہ جاری ہے۔

3) نصرت بھٹو کیس

نصرت بھٹو کیس پاکستان کی عدلیہ کی سیاہ تاریخ میں ایک نیا باب ثابت ہوا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی اہلیہ نصرت بھٹو نے نہ صرف اپنے شوہر کی غیر قانونی قید کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا بلکہ ضیاالحق کی بغاوت اور مارشل لا لگانے کو بھی چیلنج کیا۔ جسٹس انوار الحق کی سربراہی میں نہ صرف نظریہ ضرورت کے تحت بغاوت اور مارشل لا کو جائز قرار دیا گیا بلکہ لاطینی قوانین کے اس اصول جس میں کہا گیا کہ ’’

salus populi est supreme lex''، یعنی عوام کی بہبود اعلیٰ ترین قانون ہے۔ قانون کا مقصد عوام کی بہبود ہے کو فیصلے کی بنیاد بنایا گیا اور اسے اسلامی قوانین کے مطابق قرار دیا بلکہ کہا گیا کہ یہ اصول دوسرے قوانین میں بھی تسلیم شدہ ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ ضیاالحق نے عوام کی کتنی خدمت کی اور آج پاکستان جس حال میں ہے اس کی بنیاد ایوب سے لے کر اب تک تمام آمروں کا حصہ ہے لیکن ضیاالحق اور ایوب ان میں سرفہرست رہیں گے۔ ضیاالحق کی آٹھویں ترمیم اور اٹھاون دو بی کی شق نے نہ صرف 1973 کے آئین کی شکل بگاڑی بلکہ اس کے اپنے غیر جماعتی انتخابات کے نتیجے میں وزیر اعظم محمد خان جونیجو کو گھر بھیج دیا گیا اور اس کے بعد بینظیر بھٹو کو دو بار اور نواز شریف کو ایک بار اسی شق کے ذریعے فارغ کیا گیا۔ نواز شریف کو دوسری بار مشرف کی بغاوت اور تیسری بار سپریم کورٹ کے پانامہ لیکس کیس میں فارغ کیا گیا۔

4) ظفر علی شاہ کیس

1999 میں نواز شریف کے خلاف جنرل مشرف کی بغاوت کے بعد نون لیگ کے ظفر علی شاہ جنھیں نواز شریف کے تیسرے دور میں نظر انداز کیا گیا، نے مشرف کے مارشل لا کے خلاف جسٹس ارشاد حسن خان کی سربراہی میں سپریم کورٹ میں درخواست دی جس پر سپریم کورٹ نے نہ صرف مارشل لا کو جائز قرار دیا بلکہ آمر جنرل مشرف کو اختیار دیا کہ وہ آئین میں اپنی مرضی کے مطابق تبدیلیاں کر سکتا ہے، جس کا بنیادی مقصد اس کے اقتدار کو طول دینا تھا۔ جسٹس افتخار چودھری بھی اس بنچ کا حصہ تھے۔

5) جسٹس افتخار چودھری کیس

جسٹس افتخار چودھری سے جب مشرف نے چیف جسٹس کے عہدے کا حلف لیا تو حلف کے اختتام پر جنرل مشرف اور افتخار چودھری کے درمیان دلچسپ جملوں کا تبادلہ ہوا۔ جسٹس افتخار نے جاتے ہوئے مشرف سے انگریزی میں کہا کہ جس کے معنی تھے ''سر آپ صرف میرے پیچھے کھڑے ہوں بس'' اور پھر سب نے دیکھا کہ افتخار چودھری کے ساتھ کیا ہوا اور پھر اسی افتخار چودھری نے اپنے عہدے کو کس طرح اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کیا۔ 2007 میں معطلی کے بعد افتخار چودھری کے وکیل اعتزاز احسن نے سپریم جوڈیشل کونسل میں دیکھا کہ کونسل میں شامل جج ذہن بنا چکے ہیں کہ فیصلہ افتخار چودھری کے خلاف دینا ہے تو انہوں نے سپریم کورٹ میں سپریم جوڈیشل کونسل کی کارروائی رکوانے کی درخواست دی کہ ریفرنس بدنیتی پر مبنی ہے اس لئے اس کی کارروائی روکی جائے۔ 13 رکنی بینچ جس کے سربراہ جسٹس خلیل رمدے نے سرکار کو متعدد رعایتیں دیں۔ مثلاً سوال آیا کہ چیف جسٹس کی معطلی کے ساتھ ہی قائم مقام چیف جسٹس کی حلف برداری کی تقریب میں چاروں ہائی کورٹس کے چیف جسٹس کیسے اسلام آباد پہنچے؟ شہری ہوابازی سے لاگ بک منگوانے کی بات ہوئی تو جسٹس خلیل رمدے نے انکار کر دیا، پھر ریفرنس کی کاپی منگوائی گئی تو اصل کے بجائے ڈرافٹ بھیجا گیا اور اس میں ججوں کو ننگی گالیوں پر مبنی پمفلٹ اور ججوں کے گھروں کے اندر کی تصویریں شامل کی گئیں۔ عدالت نے معمولی جرمانہ کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا۔ پھر مختصر فیصلہ سنا کر افتخار چودھری کو بحال کر دیا گیا لیکن تفصیلی فیصلہ نہ دیا گیا اور معاملہ یہاں تک لٹکا کہ افتخار چودھری اور دوسرے ججوں کو ایک بار پھر گھر بھیج کر نظر بند کر کے ایمرجنسی لگا دی گئی۔ اس کیس اور ایمرجنسی کیس کی تمام کارروائی میں نے کور کی تھی۔ اس پر ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

6) جنرل مشرف دہرا عہدہ کیس

2007 میں، 2002 میں منتخب کی گئی اسمبلی اپنی مدت ختم کرنے والی تھی تو چونکہ مشرف کو اندازہ تھا کہ اگلی اسمبلی سے وہ دوبارہ وردی میں صدر منتخب نہیں ہو سکے گا تو فیصلہ کیا کہ اسی اسمبلی سے وہ وردی میں اپنے آپ کو صدر منتخب کرا لے جسے سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ جسٹس خلیل رمدے کی قیادت میں بینچ نے طویل بحث کے بعد فیصلہ دیا کہ وہ انتخاب لڑ لیں، لیکن اس کے نتائج کا اعلان اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک کہ عدالت کیس کا فیصلہ نہ کر دے۔ عدالت نے تین سینئر ترین وکلا چودھری اعتزاز احسن، ایس ایم ظفر، اور عبدالحفیظ پیرزادہ مرحوم کو عدالت کی معاونت کے لئے مقرر کیا، ان میں سے چودھری اعتزاز اور ایس ایم ظفر نے مشرف کی وردی میں دوسری بار ایک ہی اسمبلی منتخب ہونے کی شدید مخالفت کی۔ حفیظ پیرزادہ نے حمایت کی۔ اس کے باوجود مشرف کو انتخاب لڑنے کی اجازت دی گئی۔ بس کیا تھا کہ ملک میں ایک بار پھر ایمرجنسی لگا کر مشرف نے گھر جاتی ہوئی اسمبلی سے اپنے آپ کو دوسری بار صدر منتخب کرا لیا۔ خلیل رمدے کے لٹکتے فیصلے نے پورے ملک کو ایک بحران کا شکار کر دیا۔ قصہ مختصر، چاہے یوسف رضا گیلانی کے ایک خط نہ لکھنے کا معاملہ ہو یا نواز شریف کو پانامہ گیٹ میں کرپٹ یا ڈان قرار دے کر فارغ کرنا ہو، یا پھر آرمی چیف کی مدت ملازمت میں توسیع کا سلسلہ ہو، یا پھر اپنے ہی بھائی جج کی بیوی کے ٹیکس معاملات ہوں، ججوں نے اپنی نوکری کو اولیت دی، نہ کہ انصاف کی فراہمی کو یقینی بنایا۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ جسٹس قاضی فائز عیسیٰ نے بھی فیض آباد دھرنا کیس میں فیصلے پر عمل درآمد کی رپورٹ آنے تک کیس کو زندہ رکھنا چاہے تھا، جیسا کہ ان کے اپنے خلاف کیس کو اب تک زندہ رکھا گیا ہے۔ اس وقت تک کہ جب تک ان کی اہلیہ کے ٹیکس کے معملات کو سپریم جوڈیشل کونسل کلیئر نہیں کر دیتی۔ بعض ماہرین تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ ایک نیا ریفرنس بن سکتا ہے جو جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کے لئے نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ جج جس کے خلاف ریفرنس بدنیتی پر مبنی قرار پایا وہ اب بھی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہے اور جو بدنیت ٹھہرے ان کے بارے میں کوئی سزا تجویز نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے تفصیلی فیصلے میں اس کی وضاحت ہو، جس کا سب کو انتظار ہے۔

آیئے ملتے ہیں صبر و شکر کرنے والوں سے!

تحریر: آر انور۔ٹورونٹو کینیڈا

نعمت خداوندی ہوتی ہے کہ ایک متنفس کو دنیا ایک خوبصورت نام کے ساتھ یاد کرے۔ اس میں دعائیں بھی ہوتی ہیں اور کچھ تمنّائیں اور آرزوئیں بھی ساتھ شامل ہوجایا کرتی ہیں۔ لیکن اگر وہی دنیا کی امیدوں کی آماجگاہ جب ظلم و بربریت کی تصویر بن جائے تو پھر یہ دنیا اسکو کبھی اس طرح بھی سزا دیتی ہے کہ اس کے انتہائی محبت سے رکھے ہوئے نام کو ایسے بھلا دیتی ہے کہ گویا یہ نام اس شخص کی کبھی بھی پہچان نہیں رہا۔ایک مشہور مثال اس کی ایک ابوالحکم کہلانے والا وجود تھا جس نے . غرور و تکبر اور ظلم و بربریّت کی راہ اختیار کی تو تاریخ انسانی نے اس کی حکمت و دانائی یک سر فراموش کر کے اسے جہالت کے باپ کے نام سے پکارنا شروع کردیا۔اب تو شک کی ذرہ بھی گنجائش نہیں کہ رہتی دنیا تک جہالت کی یہ دُم اس بد بخت کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔تاریخ نے یہ سلوک انسان کے ساتھ کرر، سہ کرر، چہ کرر، پنج کرر بلکہ ان گنت مرتبہ کیا ہے لیکن انسان نہ جانے کس گھمنڈ میں یا کس حماقت میں اس سے سبق ہی نہیں سیکھتا۔آج کل ایک صاحب خود کو آسمان صحافت کا ستارہ کہتے ہیں، کسی کو در خور اعتناء نہیں لاتے والدین نے تو صبر و شکر کی امیدیں اور دعائیں ان کے لئے کی ہونگیں لیکن یہ صاحب چلے ہیں ان سب اُمیدوں کو خاک میں ملانے۔اگر انہوں نے اور ان کی طرح کے دوسرے لوگوں نے تاریخ رفتہ سے سبق نہ سیکھا تو نہ جانے یہ زمانہ انہیں کس نام سے یاد کرے گا۔عقلمند قاری کو چند اشارے دے دیتا ہوں۔اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرماتا ہے، کہا کہ:"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو" (الحجرات:۷)۔اب ایسے شخص کو خدا تعالیٰ نے بڑے واضح انداز میں فاسق کا نام دیا ہے۔کہیں صبر و شکر کے یہ داعی فسق و فجور کی چادر اوڑھے ہوئے نظر نہ آنے لگ جائیں۔ شاید خدا کا خوف کسی طور ان کے دل تک پہنچ گیا ہو پھر بھی جس رسول کی غلامی کا دَم یہ بھرتے ہیں اسی کا ایک قول بھی سنائے دیتا ہوں۔اس سید الکونین نے فرمایا:"تم لوگ جھوٹ بولنے سے بچو، کیونکہ جھوٹ برائی کا راستہ دکھاتا ہے اور برائی دوزخ کا راستہ دکھاتی ہے، اور انسان لگاتار جھوٹ بولتا رہتا ہے، جھوٹ بولنے کا متمنی رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے" (صحیح مسلم)۔

خوف کا مقام ہے کہ اللہ کے ہاں جس شخص کا نام جھوٹا لکھ دیا جائے تو اس کا کیا انجام ہوگا؟ یقینا ایسا انسان صبر و شکر کی طرف تو کبھی منسوب نہیں ہوگا !۔کہاں گئی آپ کی حِس عدل کہاں گئی آپ کی بے چارہ اور بے سہارا پروری۔اے دنیا کی ہواؤں کے رخ پہ چلنے والے صبر سے کام لو حقیقی اسلام کی فتح کی ہواؤں کی خوشبو ہمیں تو آرہی ہے۔تمہاری بہاریں خزاؤں میں اور ہماری خزائیں بہاروں میں بدلنے والی ہیں، اے شاکر کہلانے والے ذرا صبر تو کر قوموں کی زندگی میں بیس، پچیس تیس سال بلکہ پچاس یا سو سال بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔صرف رسمی اور خشک ملاؤوں کی باتوں کی اندھی تقلید کر رہے ہو۔ذرا خود وقت نکال کے بلا واسطہ غیر ے احمدیت کا مطالعہ تو کر دیکھ۔اس واقعہ سے ہی سبق سیکھ لو۔حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے اطلاع ملی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے، اس وحشت ناک خبر کو سن کر میں اپنے گھر سے چل کر مسجد میں گیا، کچھ دیر وہاں توقف کیا تو کچھ لوگ وہاں بھی یہی باتیں کر رہے تھے یہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ اس خبر کی تحقیق کرنی چاہیے، میں اجازت لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا یا رسول اللہ! کیا حضور نے اپنی بیبیوں کو طلاق دے دی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا نہیں۔میں نے تعجب سے کہا: اللہ اکبر اور پھر مسجد کے دروازے پر آکر بلند آواز سے ندا کردی کہ یہ خبر غلط ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بیبیوں کو طلاق نہیں دی۔اس واقعہ میں جس طریقہ کو حضرت عمرؓ نے اختیار کیا ٹھیک یہی طریقہ ہم سب کا بھی ہونا چاہیے۔اس کے برخلاف عمل کے نتیجہ میں ہم خود جھوٹ کو فروغ دینے والوں میں شامل ہوجائیں گے، جو کسی بھی لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔ایک مقبول سمجھے جانے والے چینل کے پلیٹ فارم سے اس قدر بڑا جھوٹ ایسے بولا جیسے کوئی یہ خبر اپنے کانوں سے سن کر آیا ہو۔اور جلدی اس بات کی ہو کہ کہیں کوئی اور اس خبر کو اس سے پہلے نہ سنا دے!

اے صبر سے ناآشنا صابر ، آفرین ہے تمہاری چُستیوں پر!

تو صاحب یہ بات بھی بگوش ہوش سن لو کہ غلط ہے سراسر غلط ، کہ احمدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین نہیں مانتے۔ایسی بات صرف وہی کہہ سکتا ہے جو عقل و فہم کا دشمن ہو۔مجھ سے پوچھو تو میں کہوں گا کہ صرف احمدی ہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین مانتے ہیں۔یہ حسین کا غلام کہلانے والا ، بلا وجہ اور غیر منطقی ہاں میں ہاں ملانے والا جو اپنی غیرت کو بھی بیچ کر کھا بیٹھا ہے اور اس حسین کی غلامی کا استحقاق بھی کھو بیٹھا ہے کیونکہ وہ حسین جس کو میں جانتا ہوں وہ تو گردن کٹوا سکتا تھا لیکن ناممکن تھا کہ وہ حق کو چھپائے اور منافقت کی راہ اختیار کرے۔لیکن حسین کی طرف خود کو ناحق طور پر منسوب کرنے والا اور اس جیسے اور کئی جو اپنے زُعم میں خدائی فرستادہ کا پیغام مٹانے کا عزم لے کے اٹھیں گے سب کے سب ہی ایک روز اپنی روباہی حرکتوں پر آنسو بہائیں گے اور دانت پیسیں گے۔وقت ہے کہ "دانشور" ہونے کا ثبوت دیں۔ورنہ تاریخ بتاتی ہے کہ ان سے کہیں طاقت ور فراعنہ اور ہوامین اور نمرودو ، خدا کے فرستادوں کے مقابل لازمًا رسوائی کا شکار ہوئے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اور ارشاد ہے کہ:"ہلاکت ہے ایسے شخص کے لیے جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے اپنے بیان میں جھوٹ بولے۔ہلاکت ہے اُس کے لیے، ہلاکت ہے اُس کے لیے" (سنن ترمذی و ابوداؤد)۔

یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد میں پوچھتا ہوں کہ آپ جو یہ کہتے ہو کہ "پاکستان چیپٹر "ناخوش ہے لندن سے، آپ کہتے ہو کہ وہ تیار ہے خود کو اقلیت تسلیم کرنے کے لئے۔آپ خود اپنے بیان کو دوبارہ سنئے یہ تو خود تضادات کا ایک گورکھ دھندہ ہے۔اور یقینا صداقت اس کو چھو کر بھی نہیں گئی۔کیا یہ سمجھ لیں کہ ایسا بیان پاکستان کے کسی احمدی لیڈر نے آپ کے سامنے دیا ہوگا!!!! اگر سچ بولنا آپ کا شیوہ ہے تو ذرا اس لیڈر کا صرف نام ہی بتادو۔مجھے یقین ہے کہ قیامت تک آپ ایسا نہیں کرسکو گے ہاں البتہ چاند پر تھوکنے والے کہ مانند سارا تھوک خود آپ کے چہرے پر آنے والا ہے۔بے شک میرے اس خط کا جواب نہ دینا البتہ خدا کی طرف سے آنے والی ذلّت کے ضرور منتظر رہنا کیونکہ نہ صرف آپ نے جھوٹ بولا ہے بلکہ بولا بھی برکتوں والے رمضان کے مہینے میں ہے۔میں تو بس یہی دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو معاف کردے اور حق کو پہچاننے کی توفیق عطا فرمادے۔آمین

این اے 35 بنوں: تحریک انصاف کا عالم دین امیدوار اور لال مسجد والا مساج سینٹر

شعبہ پاکستان

تحریر: رضوان ظفر گورمانی

گیارہ برس قبل لال مسجد کی طالبات کے جتھے نے جب خدائی فوجدار بن کر اسلام کی نصرت و کامرانی کے نام پر چینی مساج سینٹر پر دھاوا بولا، تو وہاں محبوس کیے جانے والوں میں سے بنوں کے اک معروف عالم دین مذہبی رہنما کے دو فرزند بھی شامل تھے۔ اب سینہ ٹھونک کر اسلام کی سربلندی اور اسلامی شریعہ کے نفاذ کے اعلیٰ مقصد کے لیے ریاست کے اندر لشکر کشی کرنے والوں کے امام و امیر المومنین علامہ عبدالرشید غازی صاحب نے قاضی القضاۃ کا کردار ادا کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ میری خواہش ہے کہ ان دونوں کو میڈیا کے سامنے پیش کرنے سے قبل چھوڑ دیا جائے، کیونکہ ان کا تعلق اک مذہبی سیاسی جماعت سے ہے اور دونوں عالم دین کے فرزند ہیں، پھر علامہ صاحب نے مساوات و بھائی چارے کی اعلیٰ مثال قائم کرتے ہوئے واقعی میں ان دونوں کو خفیہ راستے سے باہر نکال دیا۔ لیکن وہ کہتے ہیں نہ تاڑنے والے بھی قیامت کی نگاہ رکھتے ہیں، یہ خبر پوشیدہ نہ رہ سکی اور اگلے دن چند اخبارات میں چھوٹی سی سہی، خبر شائع ضرور ہوئی تھی کہ مساج سینٹر سے عالم دین کا فرزند بھی پکڑا گیا۔ مبینہ طور پر پتلی گلی سے بھگائے جانے والے یہ نوجوان بنوں کے بڑے دینی مدرسے جامعہ المرکز الاسلامی کے مہتمم اور عمران خان کی چھوڑی ہوئی بنوں سیٹ (این اے 35) پر پی ٹی آئی کے عالم دین امیدوار مولانا سید نسیم علی شاہ ہیں۔ نسیم علی شاہ سابق ایم این اے اور جے یو آئی کے مرکزی مجلس فقہی کے سابق سربراہ مولانا سید نصیب علی شاہ مرحوم کے فرزند ہیں۔ راقم کو ان کے مساج سینٹر جانے پر اعتراض ہے نہ الیکشن میں حصہ لینے پر۔ تحریر کا مقصد صرف کہ جو امیر المومنین من پسند ملزم کو فرار ہونے میں معاونت فرمائے، اسے دین اسلام کے ٹھیکے دار بننے میں شرم دکھانی چاہیے تھی۔ جہاد و قتال کی باتیں، اسلامی ریاست کے قیام اور شہادت کے فضائل بیان کرنے والے اک اور غازی عام طلبا و طالبات کو اس لڑائی کا ایندھن بنا کر خود برقع اوڑھ کر مقدس میدان جنگ سے فرار کی کوشش فرماتے پکڑے گئے تھے۔ اپنی مرضی کی شریعت نافذ کرنے کی شاندار تاویلیں وہی لوگ پیش کر سکتے ہیں جو قرآنی آیات اور احادیث کی من پسند تشریحات کے ذریعے بچی کھچی مسلم امہ میں تعصّبات کی آگ بھڑکانے میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ریاست ان غبی عالم دین کے ہذیان کا نوٹس بھی نہیں لیتی، یہ اک طرف شہادت کی ریوڑیاں بانٹتے پھرتے ہیں تو دوسری طرف تکفیری طالبان کی حوصلہ افزائی میں اس حد تک آگے چلے جاتے ہیں کہ آرمی پبلک سکول جیسے سانحے کی مذمت کرنے سے کتراتے ہیں۔ مائی لارڈ جیسے منصف اک طرف تو دوروں پہ دورے اور ڈیمز کی تعمیر کے شوق میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں دوسری طرف ماڈل ٹاؤن کے قاتلوں اور برقع ملاں جیسے دین فروش شدت پسندوں کے خلاف کارروائی کرتے وقت ان کے عزم اور اختیار میں تزلزل پیدا ہو جاتا ہے۔

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
اب کیا بتاؤں رات مجھے کس کے گھر ملے

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرمالیں ادارتی نوٹ مضمون کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہو اسی لیے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرمالیں آن لائن ویب سائٹ اور رسالے میں شائع شدہ مواد کاپی رائٹ ہیں۔ بلا اجازت آرٹیکل شائع کرنا کاپی رائٹس قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا کر رہے ہیں انکو متنبہ کیا جارہا ہے۔

میری بے ایمانیاں

تحریر: برگیڈیر بشیر آرائیں

میں 1995 میں یو این پیس کیپنگ مشن میں بوسنیا کے شہر Tuzla کے قریب Visca کیمپ میں پاک فیلڈ ہاسپٹل کمانڈ کر رہا تھا۔ یونائیٹڈ نیشن مشن کے مطابق ہم صرف وہاں کے شہریوں کا علاج معالجہ اپنے فیلڈ ہاسپٹل میں رہ کر کر سکتے تھے ہمارے ساتھ پاکستان سے لیڈی ڈاکٹرز یا نرسز نہیں گئی تھیں۔ ہمیں UN سے اجازت ملی کہ ہاسپٹل میں Bosnian Nurses کو ملازم رکھ لیں۔ بہت کوشش کی نرسز تو نہ ملیں مگر 18 میڈیکل اسٹوڈنٹس مل گئیں جو یونیورسٹی بند ہونے کی وجہ سے فارغ بیٹھی تھیں۔ وہ انگلش بھی بولتی تھیں تو اس طرح ہمارے اور لوگوں کے درمیان ترجمانی کا مسلہ بھی حل ہو گیا۔ ایک لڑکی جو میرے ساتھ ترجمانی کے فرائض سرانجام دیتی تھی نے بتایا کہ ڈاکٹرز نہ ہونے کی وجہ سے Tuzla Hospital کا حال بہت برا ہے۔ بوسنیا کے زخمی لوگ وقت پر آپریشن نہ ہونے کی وجہ سے مر رہے ہیں اور انکو آپ کے پاس بھی نہیں لایا جا سکتا۔ میں نے کہا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں ہم تو صرف UN Charter کے مطابق کام کرتے ہیں کہ یہاں لے آؤ تو آپریشن کر دیں گے۔ کہنے لگی ہماری ایک پروفیسر آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ بہرحال دوسرے دن شام ڈھلے ایک خاتون مجھ سے ملنے آئی۔ بات کرتے ہوئے وہ بمشکل اپنے آنسو چھپا رہی تھی۔ وہ انیستھیسیا کی پروفیسر تھی اور مدد مانگنے آئی تھی۔ کہنے لگی کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ہمارے 15 سے 20 لوگوں کے آپریشنز ہاسپٹل میں آ کر کر دیں کہ وہ اپاہج ہونے سے بچ جائیں۔ میں نے اپنے پاکستانی فورس کمانڈر سے بات کی تو انہوں نے لاپرواہی سے کہا کہ کر سکتے ہو تو ضرور کرو لیکن اگر شکایت ہوئی تو میں بچاؤں گا نہیں۔ سزا کے لئے تیار رہنا۔ دوسرا مرحلہ میرے اپنے سرجن اور بیہوشی والے ڈاکٹر کو منانا تھا۔ دونوں سے الگ الگ بات کی کہ انکے ہاسپٹل میں وقت نکال کر جانا ہوگا۔ میجر جنجوعہ تو فوراً مان گیا مگر سرجن نے ڈرتے ڈرتے حامی بھری۔ میں نے اپنے کمانڈر کو بتایا کہ آج رات ہم مشن پر جائیں گے۔ کہنے لگے واپسی پر مجھے اطلاع کر دینا۔ ہم تینوں رات کے کھانے کے بعد واک کے لئے نکلے اور دور کھڑی گاڑی میں بیٹھ کر کیمپ سے غائب ہو گئے۔

اس رات Tuzla Hospital میں اس پروفیسر کے علاوہ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ ہم کون ہیں۔ وہ زخمیوں کو اپنے بچوں کی طرح پیار سے دلاسے دے رہی تھی کہ اب تم ٹھیک ہو جاو گے۔ اس رات تین لوگوں کا آپریشن ہوا۔ میں ایک آفس میں بیٹھا دعائیں کرتا رہا کہ خدا خیر کرے۔ باہر بلا کی سردی تھی۔ رات کے تین بجے واپسی پر میں نے کمانڈر کو فون کیا تو انہوں نے پہلی گھنٹی پر فون اٹھایا اور صرف اتنا کہا اوکے اب میں سونے لگا ہوں۔ پھر یہ سلسلہ تب تک چلتا رہا جب تک انکے تمام زخمیوں کے آپریشن مکمل نہ ہو گئے بلکہ کبھی کبھار ہم خود بھی پوچھ لیتے۔ میں اور میجر جنجوعہ پاکستان واپس آنے سے پہلے اس پروفیسر سے ملنے گئے۔ ہمیں رخصت کرتے ہوئے وہ اپنے آنسو صاف کرتی رہی اور کہنے لگی کہ ہم آسماں پر خدا سے اور زمین پر پاکستانی فوج سے امیدیں لگا کر دن گزارتے رہے ہیں۔ آپ خیریت سے اپنے ملک جایئے۔ صرف میں نہیں میری پوری قوم آپ کی احسان مند رہے گی اور پھر جب بوسنیا سے پاکستان آرمی واپس آ رہی تھی تو تزلہ شہر کے لوگ باہر سڑکوں پر کھڑے پھول پھینک کر ہمیں الوداع کہہ رہے تھے۔ واپسی پر دوران فلائیٹ میں نے اپنے کمانڈر سے شکوہ کیا کہ سر اگر ہماری شکایت ہو جاتی کہ ہم اپنے ہاسپٹل سے باہر جا کر لوگوں کے آپریشن کرتے تھے تو کیا واقعی آپ ہمارا ساتھ نہ دیتے۔ کہنے لگے بوسنیا کے ایک سینیئر ڈاکٹر نے یہ بات پہلے مجھ سے کی تھی۔ اسے میں نے ہی راستہ دکھایا تھا کہ یہ غلط کام خوش اسلوبی سے کون سرانجام دے سکتا ہے۔ میں پوچھتا رہا کہ سر یہ بات میں اپنی تعریف کے زمرے میں لوں یا سدھرنے کیلئے وارننگ سمجھوں۔ اس قوم کی دعائیں کچھ تو لگیں ہونگی کہ ہم چاروں میں سے ایک میجر جنرل اور تین برگیڈیر رینک سے ریٹائر ہوئے۔

خواجہ حسن نظامی دہلوی کا سفرنامہ پاکستان

تحریر: ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔ آسٹریلیا

برصغیر کی مشہور تاریخی، علمی اور ادبی شخصیت، شمس العلماء خواجہ حسن نظامی صاحب بانی انجمن مشائخ ہند نے سنہ 1950 میں پاکستان کے دو دورے کیئے تھے اور اپنے سفر کے حالات کتابی شکل میں شائع فرمائے۔ قارئین کی خدمت میں اس سفرنامہ کے تین دلچسپ، سبق آموز اور فکر انگیز اقتباسات پیش کیئے جاتے ہیں جو کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔

مولانا سر ظفراللہ خان

مولانا سر ظفراللہ خان صاحب وزیر خارجہ پاکستان میرے بہت پرانے دوست ہیں اور ان کی علمیت اور اسلامی جراءت کو میرے دل پر ہمیشہ سے نقش ہے۔ انہوں نے مجھ کو میرے لڑکے حسین کے ساتھ چاء کے لئے بلایا تھا۔ میں نے ان سے اسلامی ملکوں کی نسبت بہت سوالات کیئے اور انہوں نے ذاتی تجربوں کی بنا پر بہت اچھے جوابات دئے۔ مگر نہ انہوں نے کوئی سیاسی بات کی نہ میں نے ان کی حکومت کی پالیسی کی بابت کوئی گفتگو کی۔ اور میں ممنون ہوا کہ جب میں نے ان سے ذکر کیا کہ میں ہمیشہ محمد بن قاسم کی برسی منایا کرتا ہوں جو شعبان میں ہوتی ہے، اب چونکہ وہ تاریخ کراچی میں آئی ہے تو ارادہ ہے کہ یہاں بھی وہ برسی کروں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس سے اختلاف ہے، اب آپ کو کوئی کام ایسا نہ کرنا چاہیئے جس سے آپ کی حکومت کو آپ سے اختلاف پیدا ہو۔ دور اندیشی کا یہ مشورہ بہت زیادہ قابل قدر تھا۔ اور دوسرا اثر مجھ پر یہ ہوا کہ وہ ان سیاسی خودغرضیوں سے پاک ہیں جو آج کل ساری دنیا کے سیاسی لوگوں پر چھائی ہوئی ہیں"۔ (پاکستان کا سفرنامہ از خواجہ حسن نظامی۔ مطبوعہ دہلی پرنٹنگ ورکس۔ نومبر 1952۔ صفحہ 13، 14)

جماعت احمدیہ کا جلسہ سیرت النبی ﷺ

دہلی میں قادیانی جماعت کے لوگ جب سیرت نبوی ﷺ پر جلسہ کرتے تھے تو مجھے صدر بناتے تھے اور اس سلسلے میں مجھ پر حملے بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ جامع مسجد دہلی کے سامنے پریڈ کے میدان میں جلسہ ہوا اور میں نے صدارت کی اور جمیعت علماء کے لوگوں نے مجھ پر حملہ کیا اور دوسری طرف عربک کالج دہلی میں جلسہ قرار پایا اور میں نے صدارت کا وعدہ کرلیا۔ وہاں گیا تو معلوم ہوا کہ جلسہ گاہ بدل گئی ہے مگر احراری پارٹی وہاں موجود تھی۔ اس نے مجھ پر حملہ کیا۔ میرا اگلا گھونٹا، داڑھی کھینچی، چہرے پر تھوکا۔ اس وقت میری موٹر میں بمبئی کے گجراتی اخبار "بے گھڑی سوچ" کے ایڈیٹر بھی تھے۔ موٹر کے باہر مولانا اسماعیل عشقی نظامی نے ان لوگوں کو مارنا شروع کیا اور ایک آدمی نے دس بارہ کو مار بھگادیا۔ تھوڑی دیر میں پولیس آگئی اور اس نے مجھ سے پوچھا کن لوگوں نے حملہ کیا تھا۔ میں نے کہا کسی نے حملہ نہیں کیا۔ میں پولیس کی امداد نہیں چاہتا۔ مفتی شوکت فہمی صاحب پولیس کو لائے تھے، انہوں نے کہا آپ ایسی درگزر کریں گے تو ہمیں پبلک کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ میں نے جواب دیا قرآن ارشاد فرماتا ہے کہ "مومن وہ ہیں جو غصے کو پی جائیں اور لوگوں کی خطاؤں کو معاف کر دیں"، اس لیئے میں کسی سے انتقام لینا نہیں چاہتا۔ کراچی میں بھی قادیانی جماعت نے جلسہ کرنا چاہا تو مجھے صدارت کے لئے بلایا۔ میرے مریدوں نے کہا یہاں عوام کی فضا خراب ہے، صدارت مناسب نہیں ہے۔ میں نے کہا رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم) کا ذکر جو بھی کرے گا میں وہاں سننے کے لئے جاؤں گا۔ چنانچہ میں وہاں گیا اور صدارت کی۔

بہت بڑا جلسہ تھا

ہندوؤں اور عیسائیوں کی تقریروں پر تبصرے بھی کئے کیونکہ اس کی ضرورت تھی۔ مگر ایک قادیانی مولانا نے تقریر کی تو میں نے اس پر تبصرہ نہیں کیا، کیونکہ میرا اصول یہ ہے کہ غیر مسلم مداحوں کی ہمت افزائی کرتا ہوں۔ قادیانی جماعت کے اراکین شیخ اعجاز احمد صاحب (علامہ اقبال کے بھتیجے۔ ناقل) اور چوہدری بشیر احمد صاحب بھی وہاں ملے تھے"۔ (ایضاً: ص 75،76)

گورنر جنرل کی ٹی پارٹی ایک کپ چاء اور دو بسکٹ

شام کو (11 دسمبر 1950۔ ناقل) ٹینس میچ کے اراکین اور بیرونی مہمانوں کو اور گورنر جنرل کو لاہور کے شہریوں کی طرف سے ایک بڑی ٹی پارٹی دی گئی تھی۔ میری نشست کے قریب بیگم فدا حسین صاحب کمشنر لاہور بھی بیٹھی تھیں، خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب فلک پیما وغیرہ اکابر بھی وہاں تھے۔ پارٹی میں صرف چاء کی ایک پیالی اور دو بسکٹ دئے گئے۔ میں خوش تھا کہ پاکستان نے خدا کے حکم پر توجہ کی۔ کیونکہ قرآن میں خدا نے فرمایا ہے کہ "کھاؤ اور پیو مگر فضول خرچی نہ کرو کیونکہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہوتے ہیں۔ میں یہ خیال کر رہا تھا کہ میرے قریب کھڑے ہو کر ایک شخص نے انگریزی میں کہا، جس کے سامنے لاؤڈ سپیکر بھی تھا، جس سے میں نے یہ بات سمجھی کہ کمشنر صاحب کی بیوی اب کچھ تقریر کریں گی۔۔۔ بیگم صاحبہ نے کھڑے ہو کر نہایت فصیح و بلیغ اور شستہ و شائستہ اردو زبان میں تقریر کی اور کہا کہ ہم نے اس پارٹی کے لئے پچیس ہزار روپے جمع کئے تھے اور ہم چاہتے تھے کہ اس پارٹی میں کھانے کی اتنی چیزیں جمع کریں جو پاکستان کے شایان شان ہوں۔ مگر ہم نے صرف چاء کی ایک پیالی اور دو بسکٹ دیئے اور بچا ہوا روپیہ ان لوگوں کے لئے رکھ دیا جو گزشتہ سیلاب کی مصیبت کے سبب تباہ و پریشان ہوگئے ہیں"۔ (ایضاً: ص 88،89)

وے صورتیں الٰہی کس مُلک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

کمیونسٹ انٹرنیشنل کے سو سال

تحریر: راب سیول، ترجمہ: ولید خان

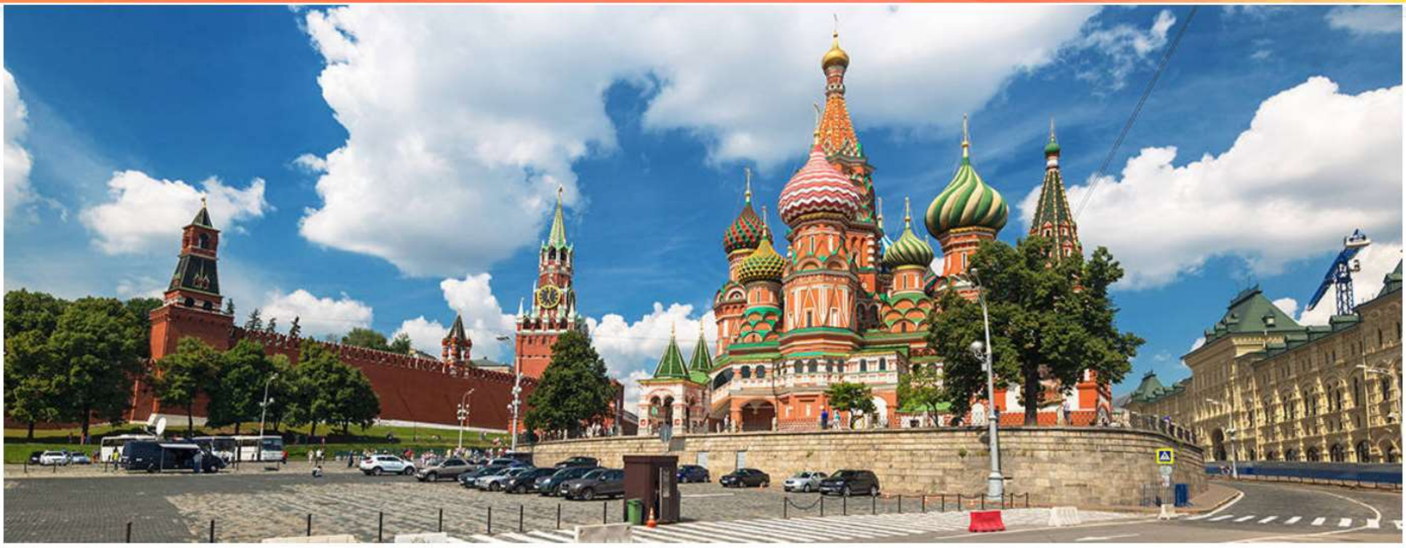

(ایک صدی قبل 2 تا 6 مارچ 1919ء کو ماسکو شہر میں تیسری انٹرنیشنل کی پہلی کانگریس منعقد ہوئی۔ یہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کا آغاز تھا جو مستقبل میں انقلابی نظریات اور حکمتِ عملی کی اہم درسگاہ ثابت ہوئی۔ راب سیول (ایڈیٹر سوشلسٹ اپیل) اس اہم تاریخی واقعے کے خدوخال قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔)

"میں تھیٹر تقریباً پانچ بجے پہنچا اور صحافی کا اسپیشل ٹکٹ ہاتھ میں ہونے کے باوجود اندر داخلے میں خاصی دشواری ہوئی۔ تمام دروازوں کے باہر طویل قطاریں تھیں۔ ماسکو سوویت، مجلس عاملہ، ٹریڈ یونینز اور فیکٹری کمیٹیوں کے نمائندگان وغیرہ سب موجود تھے۔ دیوہیکل تھیٹر اور پلیٹ فارم کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے، یہاں تک کہ لوگ راہداریوں اور سٹیج کے احاطے میں بھی موجود تھے۔ کامینیف صاحب نے انتہائی سنجیدگی سے کریملن میں تیسری انٹرنیشنل کی تاسیسی میٹنگ کے آغاز کا اعلان کیا۔ لوگ انتہائی گرمجوشی سے اعلان کا استقبال کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور 'انٹرنیشنل' ایسے جوش و جذبے سے گایا جس کی آخری جھلک میں نے کل روسی اسمبلی میں دیکھی تھی جب بریسٹ مذاکرات کے دوران جرمنی سے ہڑتالوں کی خبریں پہنچی تھیں۔" یہ الفاظ ایک چشم دید گواہ اور برطانوی صحافی آرتھر رانسوم کے ہیں جو مارچ 1919ء میں بولشوئی تھیٹر میں منعقد ہونے والی کمیونسٹ (تیسری) انٹرنیشنل کے تاسیسی اجلاس میں موجود تھا۔ ماسکو ابھی بھی شدید سردی کی گرفت میں تھا۔ ایک فرانسیسی مندوب کے مطابق، "ماسکو ایندھن کی شدید قلت کا شکار ہے۔ کانگریس کے مندوبین سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں۔ ماسکو پچھلے دو سالوں سے انتہائی قلیل راشن پر گزارا کر رہا ہے۔ غیر ملکی مندوبین کو ہمیشہ پیٹ بھر کر کھانا میسر نہیں ہوتا۔۔۔" دو درجن سے زائد ممالک سے آئے 51 مندوبین، جن میں سے اکثریت سامراجی ناکہ بندی اور خاردار تاروں کو عبور کر کے آئے تھے، ماسکو میں نئی انٹرنیشنل کے تاسیسی اجلاس میں شریک تھے۔ ان گنتی کے افراد کا اکٹھا ہونا ہی ایک حیران کن معجزہ تھا کیونکہ ناکہ بندی کرنے والوں کے لئے یہ اکٹھ "غیر قانونی" تھا۔ نتیجتاً کچھ مندوبین گرفتار بھی ہوئے اور اس وجہ سے اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے۔

پہلی اور دوسری انٹرنیشنل

تیسری انٹرنیشنل کا جنم پہلی عالمی جنگ کی عظیم غداری اور اکتوبر 1917ء کے تاریخ ساز روسی انقلاب کے نتیجے میں ہوا۔ جیسا کہ نام سے واضح ہے، اس سے پہلے بھی دو انٹرنیشنلز بنی تھیں، پہلی اور دوسری، جن کی تاریخ میں ہم مارکسزم کا ارتقاء اور ان ٹوٹ دھارا تلاش کر سکتے ہیں۔ پہلی انٹرنیشنل (جسے محنت کشوں کی عالمی ایسوسی ایشن کے نام سے جانا جاتا ہے) کی بنیاد 1864ء میں مارکس اور اینگلز کی براہِ راست شرکت سے پڑی۔ یہ تنظیم چھوٹی ہونے کے باوجود عالمی سوشلزم کے لئے مزدور جدوجہد میں سنگِ میل ثابت ہوئی۔ لیکن تنظیم 1871ء میں پیرس کمیون کی ناکامی کے بعد یورپ میں پھیلنے والی رجعت کا شکار ہو گئی۔ بالآخر اسے 1876ء میں تحلیل کر دیا گیا۔ ایک دہائی بعد دوسری انٹرنیشنل کی بنیاد رکھنے میں اینگلز شامل تھا۔ اپنے پیشرو کے برعکس، اس میں شامل محنت کش عوام کی پارٹیاں لاکھوں افراد کی نمائندہ تھیں۔ لیکن اس انٹرنیشنل کی تعمیر سرمایہ داری کے ابھار کے کے دور میں ہوئی جس میں کوئی بڑی انقلابی جدوجہد موجود نہیں تھی۔ اس معروضی صورتحال میں قیادت موقع پرستی کا شکار ہو گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ انقلابی جدوجہد پیچھے رہ گئی جبکہ اصلاحات کے لئے جدوجہد نے مرکزی حیثیت اختیار کر لی۔ لیکن جیسا کہ روزا

لکسمبرگ نے کہا تھا کہ اصلاحات اور انقلاب کی جدوجہد کے سوال کو علیحدہ کرنے کی بجائے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر دیکھنا چاہیے تھا۔ بالآخر مسحور کن تقاریر کے باوجود اس اصلاح پسندی نے عالمی مزدور تحریک کو اگست 1914ء میں عظیم دھوکہ دیا جب سوشلسٹ قیادت نے عالمگیریت کو ترک کر کے آنے والی ہولناک عالمی جنگ میں اپنے اپنے حکمران طبقات کی حمایت کی۔

زمروالڈ

اس مایوس اور پریشان کن صورتحال میں عالمی انقلاب پر یقین رکھنے والے انقلابی مٹھی بھر ہی رہ گئے۔ عالمی سوشلزم کے جذبے سے سرشار روس میں لینن اور ٹراٹسکی، جرمنی میں روز الکسمبرگ اور کارل لیبنیخت، سکاٹ لینڈ میں جان میک لین، آئرلینڈ میں جیمز کونولی، امریکہ میں جیمز لارکین اور یوجین ڈیبز اور دیگر گنتی کے افراد ہی رہ گئے تھے۔ جب 1915ء میں زِمروالڈ میں ان افراد کی پہلی میٹنگ میں ہوئی تو لینن نے چٹکلا چھوڑا کہ پوری دنیا کے بین الاقوامیت پسند بس دو بگھیوں میں ہی پورے آجائیں گے۔ یہ مذاق ان کی خوفناک تنہائی کا عکاس ہے۔ زِمروالڈ میں اس مٹھی بھر گروہ نے ایک مینی فیسٹو شائع کیا جس میں سامراجی جنگ کی شدید مذمت کی گئی، "قومی دفاع" کے نام پر حکمران طبقے کی اس جنگ کو مسترد کیا گیا اور مزدوروں سے اپیل کی کہ امن، آزادی اور سوشلزم کے لئے جدوجہد کی جائے۔ اس کے بعد 1916ء میں کینتھال میں ایک میٹنگ رکھی گئی۔ زِمروالڈ اور اور کینتھال میں لینن اور بالشویک انتہائی بائیں جانب کھڑے تھے۔ انہوں نے دوسری انٹرنیشنل (اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کے برخلاف) سے مکمل ناطہ توڑتے ہوئے ایک نئی تیسری انٹرنیشنل کے قیام کا مطالبہ کیا۔ یہی وہ بائیں بازو کا انقلابی رجحان تھا جس کے اردگرد مارچ 1919ء میں نئی انٹرنیشنل کی بنیاد رکھی گئی۔

اکتوبر انقلاب

نئی انٹرنیشنل کے لئے سب سے اہم موڑ اور مہمیز روس میں اکتوبر 1917ء کے انقلاب کی شاندار کامیابی تھی۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ (پیرس کمیون کے انتہائی مختصر واقعہ کے علاوہ) محنت کش طبقے نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا۔ بالشویک انقلاب کو کبھی بھی محض ایک روسی انقلاب کے طور پر نہیں دیکھا گیا۔ اس طرح کا خیال ہی ناقابلِ فہم تھا، خاص کر ایک پسماندہ ملک میں۔ اگر انقلاب تنہا رہ گیا تو وہ برباد ہو جائے گا۔ بالشویک اچھی طرح جانتے تھے کہ سوشلسٹ انقلاب صرف عالمی سطح پر ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ روسی انقلاب کی کامیابی کے بعد عالمی بورژوازی نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر نومولود مزدور ریاست کو کچلنے کے لئے ناکہ بندی اور فوج کشی کی۔ لیکن روسی انقلاب کے پورے یورپ میں دیوہیکل انقلابی اثرات پڑے تھے۔ ان میں سب سے اہم نومبر 1918ء کا جرمن انقلاب تھا جس نے پہلی عالمی جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ 1919ء کے اوائل میں باویریا اور ہنگری میں سوویت جمہوریاؤں کا قیام عمل میں آیا۔ اس انقلابی دور میں نئی انقلابی پارٹیوں نے جنم لیا۔۔کمیونسٹ پارٹیاں۔۔جرمنی، آسٹریا، ہنگری، ہالینڈ اور پولینڈ میں۔ دیگر ممالک میں پرانی عوامی پارٹیوں میں بالشویک نواز رجحانات تیزی سے پنپنے لگے۔ 1918ء کے اختتام پر روس میں بالشویک اس نتیجے پر پہنچے کہ عالمی انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک نئی انقلابی انٹرنیشنل وقت کی اہم ضرورت ہے جو دوسری انٹرنیشنل کی ہر قسم کی موقع پرستی اور غداری سے آزاد ہو۔ عالمی مزدور تحریک میں ہر طرح کے انقلابی، اصلاح پسند اور اعتدال پسند رجحانات منظم ہو رہے تھے۔ پہلی عالمی جنگ کی ہولناکیوں اور سرمایہ داری کے بحران سے نجات حاصل کرنے کے لئے پوری دنیا کے کروڑوں مزدور بالشویک انقلاب کی جانب امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس صورتحال سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لئے لینن نے تجویز پیش کی کہ ایک عالمی کانفرنس منعقد کرتے ہوئے صرف انہی مندوبین کو دعوت دی جائے جو: 1۔ وطن پرستوں سے مکمل ناطہ توڑیں (یعنی وہ افراد جنہوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ 1914-18ء کی سامراجی جنگ میں اپنے حکمران طبقات کی حمایت کی تھی)۔ 2۔ ابھی سوشلسٹ انقلاب اور مزدور طبقے کی آمریت چاہتے ہوں۔

3۔ اصولی طور پر "سوویت طرز حکومت" کے حامی ہوں جو "سوشلزم سے قریب تر ہے"۔ لینن نے تجویز دی کہ کانفرنس یکم فروری 1919ء کو "برلن (کھلے عام) یا ہالینڈ (خفیہ)" میں منعقد کی جائے لیکن یہ خواہش کچھ زیادہ ہی رجائیت پسند تھی۔ درحقیقت کانفرنس تجویز کردہ تاریخ سے ایک ماہ بعد ماسکو میں ہی منعقد ہوئی۔

قیادت

جرمن کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد دسمبر کے آخر میں رکھی گئی اور ایک وقت آنے پر یہ روس سے باہر سب سے زیادہ طاقتور اور سیاسی اثر ورسوخ کی حامل کمیونسٹ پارٹی بن گئی۔ "سپارٹے سسٹ ہفتے" کے بعد اس پر پابندی لگا دی گئی۔ اس کے دو مرکزی قائدین لکسمبرگ اور لیبنیخت کو قتل کر دیا گیا۔ پارٹی کی تخلیق تیسری انٹرنیشنل کی بنیادیں کھڑی کرنے میں اہم ترین ثابت ہوئی اگرچہ پارٹی قیادت کو اس کاوش کے وقت کے تعین پر اختلافات تھے۔ ان اختلافات کو بحث مباحثے کے ذریعے حل کیا گیا اور ایک بھی مندوب نے فیصلے کی مخالفت نہیں کی۔ تیسری انٹرنیشنل کی تاسیسی کانگریس کا یہ تاریخی فریضہ تھا کہ تمام شکوک وشبہات اور ابہام کو

ختم کرتے ہوئے عالمی سوشلزم کے اصول نئے سرے سے وضع کئے جائیں جنہیں پرانی غدار قیادت نے اپنے پیروں تلے روند دیا تھا۔ یہی وہ نام نہاد قائدین تھے جنھوں نے سرمایہ داری کو تاریخ کے کوڑے دان میں جانے سے بچایا تھا۔ جرمنی میں نوسکے، ایبرٹ اور شائیڈمن نے بادشاہت کے ساتھ مل کر انقلاب کو تباہ و برباد کرنے اور مزدوروں اور سپاہیوں کی کونسلوں کو کچلنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جن کے ہاتھوں میں تمام حقیقی طاقت مرتکز تھی۔ پھر جنکرز (جرمن زمیندار اشرافیہ) کے ساتھ مل کر ردِ انقلاب کی راہ ہموار کی۔ اس غداری کا حتمی نتیجہ ہٹلر کی خوفناک خون آشام آمریت کی شکل میں نکلا۔ تیسری انٹرنیشنل کا قیام اس غداری کا نتیجہ تھا۔ یورپ میں تیزی سے پھیلتی انقلابی لہر انقلابی قیادت کا تقاضا کر رہی تھی۔

بنیادیں

کانگریس میں فوری طور پر درپیش مسائل پر بحث کی گئی۔ سرمایہ داری کی موجودہ ارتقائی سطح، اصلاح پسندی کا کردار اور مزدور انقلاب کی ممکنہ اشکال زیرِ بحث آئیں۔ شرکاء کی گفتگو سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ محنت کش طبقے کی خودرو تحریک سرمایہ داری کے پہاڑ کو مسخر کرنے کے لئے کافی ہو گی۔ ٹراٹسکی کے مطابق: "پہلی کانگریس ایک ایسے وقت میں ہوئی جب کمیونزم کا ایک یورپی تحریک کے طور پر جنم ہو رہا تھا اور کچھ ٹھوس وجوہات کی بنیاد پر امید کی جا رہی تھی کہ اس سے پہلے کہ حکمران طبقہ عالمی جنگ کے بعد نئی رخ بندی اور حمایت کے نئے ستون حاصل کرے، محنت کش طبقے کی نیم خودرو تحریک شاید بورژوازی کا تختہ الٹ دے۔ اس وقت کے معروضی حالات میں اس طرح کی امید اور سوچ کچھ جائز بھی تھی۔۔۔ بہرحال، اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلی کانگریس (1919ء) کے دور میں ہم میں سے کئی ایک کا خیال تھا، کچھ کا زیادہ اور کچھ کا کم، کہ مزدوروں اور کسی حد تک کسانوں کی خودروتحریک مستقبل قریب میں بورژوازی کا تختہ الٹ دے گی۔" (کمیونسٹ انٹرنیشنل کے پہلے پانچ سال، جلد دوم) تیسری انٹرنیشنل اپنے آپ کو ابھی تک موجود دوسری انٹرنیشنل کے مدِ مقابل کے طور پر دیکھنے کی بجائے عالمی سوشلزم کا حقیقی وارث سمجھتی تھی۔ اس کی تعمیر پہلی اور دوسری انٹرنیشنل کی نظریاتی بنیادوں پر ہوئی تھی۔ لینن نے وضاحت کی: "تیسری انٹرنیشنل کی عہد ساز اہمیت یہ ہے کہ اس نے مارکس کے سب سے اہم نعرے کو جلا بخشی، وہ نعرہ جو سوشلزم اور محنت کش طبقے کے صدیوں پر محیط ارتقاء کا نچوڑ ہے، وہ نعرہ جو محنت کش طبقے کی آمریت کے نظریئے کا اظہار ہے۔ یہ قبل از وقت بصیرت اور یہ نظریہ، ایک غیر معمولی صاحبِ فہم کی قبل از وقت بصیرت اور نظریہ، حقیقت بن رہے ہیں۔ عالمی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہو چکا ہے۔"

لینن اور ٹراٹسکی

ایک انٹرنیشنل سب سے پہلے ایک پروگرام، نظریہ اور روایت ہوتی ہے اور اس کے بعد ایک ایسی تنظیم جو ان سب کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کو واضح طور پر بیان کرنا اور اس کا دفاع کرنا سب سے اہم کام تھا۔ انٹرنیشنل نے اپنا نام "کمیونسٹ" رکھا تا کہ اپنے آپ کو سوشلزم کے غدار سوشل ڈیموکریٹس سے ممتاز کیا جا سکے۔ یہ مارکس اور اینگلز اور کمیونسٹ مینی فیسٹو کی روایات کا احیاء تھا؛ ایک صاف شفاف انقلابی جھنڈا۔ روسی قائدین کے اثر و رسوخ میں اکتوبر انقلاب کی شان و شوکت کی جھلک واضح تھی۔ لینن اور ٹراٹسکی نے کلیدی سیاسی رپورٹیں دیں جن کا تعلق بنیادی سوالات سے تھا۔ لینن نے "بورژوا جمہوریت اور پرولتاریہ کی آمریت کا مقدمہ" پر رپورٹ دی۔ ٹراٹسکی نے اپنے تصنیف کردہ "پوری دنیا کے محنت کشوں کے لئے کمیونسٹ انٹرنیشنل کا مینی فیسٹو" کا تعارف کرایا۔ لینن نے وضاحت کی کہ "جمہوریت" کی بحث طبقاتی نکتہ نظر کے بغیر بے معنی اور ادھوری ہے۔ یہاں تک کہ سب سے زیادہ جمہوری ریاست بھی مٹھی بھر سرمایہ داروں کے محنت کش طبقے کے بدترین استحصال کے لئے محض ایک پردہ ہے۔ سرمایہ دار ریاست کی جگہ محنت کش طبقے کے مفادات کی علمبردار ریاست کا قیام ہی سوشلسٹ انقلابیوں کا فریضہ ہے۔ لینن کے مطابق اس کا ماڈل پیرس کمیون ہے جہاں محنت کش طبقہ مختصر عرصے کے لئے ہی سہی لیکن حاکم بنا۔ کمیون کوئی پارلیمانی ادارہ نہیں تھا بلکہ عوام کو براہ راست طور پر جواب دہ ایک ایسا ادارہ تھا جس میں قانون ساز اور عاملہ طاقت کے درمیان کوئی تقسیم موجود نہیں تھی۔

لینن نے وضاحت کی:

"سرمایہ داروں کے نزدیک 'آزادی' کا مفہوم ہمیشہ خود امیر سے امیر تر ہونے اور مزدوروں کو بھوکا مارنا رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ اصطلاح میں آزادیٔ صحافت کا مطلب امیروں کا صحافیوں کو رشوت دینے اور اپنی دولت کو استعمال کرتے ہوئے نام نہاد عوامی رائے کو تبدیل کرنے اور اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی آزادی ہے۔" لینن نے وضاحت کی کہ ہم حقیقی آزادی چاہتے ہیں۔ "پیرس کمیون نے اس حوالے سے پہلا تاریخ ساز قدم اٹھایا تھا۔ سوویت نظام نے دوسرا اٹھایا ہے۔"

سوویت طاقت

سوویتوں کا قیام بالشویک پارٹی نے نہیں کیا تھا بلکہ یہ محنت کش طبقے کی منظم ہونے کی کاوش کا عملی اظہار تھیں۔ روسی زبان میں سوویت کا مطلب ایک مزدور کونسل ہے۔ یہ مزدور حکومت کی بنیاد تھی۔ لینن نے وضاحت کی: "ریاستی قوت کا

خاتمہ ہر سوشلسٹ کا اولین فریضہ ہے، سب سے بڑھ کر یہ مارکس کا اولین فریضہ تھا۔حقیقی جمہوریت، یعنی آزادی اور مساوات اس مقصد کے حصول کے بغیر ناممکن ہے۔لیکن اس کا عملی حصول صرف سوویت یا پرولتاری جمہوریت کے ذریعے ہی ممکن ہے جس میں عوامی تنظیمیں بھرپور انداز میں شرکت کرتے ہوئے ریاستی امور کو مسلسل اور غیر متزلزل انداز میں چلائیں۔اس کے نتیجے میں ریاست کے رفتہ رفتہ مکمل طور پر مٹ جانے کا عمل فوری طور پر شروع ہو جاتا ہے۔" رمائے کی آمریت کے برعکس بالشویکوں نے مارکس کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے پرولتاریہ کی آمریت کی ترویج کی۔یہ " آمریت" محنت کش طبقے کا جمہوری اقتدار ہے، نہ اس سے کم، نہ اس سے زیادہ۔ظاہر ہے کہ آج " آمریت" کا مطلب مارکس اور لینن کے دور سے یکسر مختلف ہے۔ہٹلر اور سٹالن کی آمریتوں نے اس لفظ کے معنی ہمیشہ کے لئے تبدیل کر دیئے۔آج "پرولتاریہ کی آمریت" کی بجائے ہم "مزدور جمہوریت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔پس 1919ء میں بالشویک پارٹی نے اپنے پروگرام میں سوویت طاقت کے مشہورِ زمانہ چار سنہری اصول وضع کئے:

1۔آزاد جمہوری انتخابات اور تمام مندوبین کو فوری واپس بلانے کا حق۔

2۔کسی بھی حکومتی اہلکار کی تنخواہ ایک ہنر مند مزدور سے زیادہ نہیں ہوگی۔

3۔پیشہ ور فوج کی جگہ مسلح عوام۔

4۔بتدریج تمام ریاستی امور کو تمام مزدور باری باری ادا کریں گے۔" جب ہر کوئی افسر ہے تو پھر کوئی بھی افسر نہیں ہے۔"

عالمی انقلاب

ٹراٹسکی نے کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے عالمی انقلاب کے مینی فیسٹو کے خدوخال وضع کئے۔اس نے کہا" محنت کش طبقے کے انقلابی تجربے کو عمومیت بخشنا، تحریک سے زہریلی موقع پرستی اور وطن پرستی کو خارج کرنا، دنیا کے تمام مزدوروں کی حقیقی انقلابی پارٹیوں کی جدوجہد کو متحد کرتے ہوئے ان کی معاونت اور عالمی کمیونسٹ انقلاب کو مہمیز فراہم کرنا ہمارا اولین فریضہ ہے۔"

ٹراٹسکی کی یہ بات آج بھی اتنی ہی اہم ہے:

تضادات کے مدہم ہونے کے نظریئے کا دم بھرنے والے ماہرین شماریات اور نظریاتی جادوگر دہائیاں پوری دنیا کے چاروں کونوں سے حقیقی یا فرضی مثالیں لا کر پیش کرتے رہے کہ محنت کش طبقے کے کئی حصوں اور پرتوں کی زندگیاں بہتر ہوتی جا رہی ہیں۔بورژوا دانشور ہیجڑوں اور سوشلسٹ موقع پرست دلالوں کے شور شرابے میں مان لیا گیا کہ عوامی غربت و افلاس کی بات دفن ہو چکی ہے۔موجودہ عہد میں یہ غربت و افلاس نہ صرف سماجی ہے بلکہ حیاتیاتی اور نفسیاتی بھی ہو چکی ہے اور ہمارے سامنے اپنی پوری ہولناکی کے ساتھ ابھر آئی ہے۔"لینن نے تیسری انٹرنیشنل کی پہلی کانگریس کی پر اعتمادی کا احاطہ اپنے اختتامی کلمات میں یوں کیا:" کوئی فرق نہیں پڑتا کہ پوری دنیا کی بورژوازی کتنے پیچ و تاب کھا رہی ہے، اب اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔اس کا نتیجہ عوامی شعور کی بلندی، پرانے بورژوا جمہوری تعصّبات کا خاتمہ اور جدوجہد کے لئے تیاری کی صورت میں ہی نکلے گا۔پرولتاری انقلاب کی عالمی فتح اٹل ہے۔ایک عالمی سوویت جمہوریہ کی تعمیر کا آغاز ہو چکا ہے۔"

فاتحین عالم

پہلی کانگریس کے بعد ہر سال ایک عالمی کانگریس منعقد کی جاتی رہی۔ان سلسلہ وار کانگریسوں کے ذریعے انقلابی مارکسزم کا نظریاتی اسلحہ تیار کیا گیا، بائیں بازو کے انتہا پسند رجحانات کے خلاف، ایک متحدہ محاذ کی ضرورت پر، عوامی کمیونسٹ پارٹیوں کی ضرورت اور دیگر ایسے سوالات کے لئے جو آج بھی سلگ رہے ہیں۔تیسری انٹرنیشنل وہ سکول یا پارلیمنٹ ثابت ہوئی جہاں نظریات اور خیالات پر جامع بحث مباحثوں کے بعد مشترکہ پوزیشنیں اختیار کی گئیں۔پہلی چار کانگریسیں سنگِ میل ثابت ہوئیں۔ان کے بعد 1923ء میں جرمن انقلاب کی ناکامی اور 1924ء میں لینن کی وفات کے بعد روسی انقلاب تنہا رہ گیا۔معاشی پسماندگی اور ابتری کے حالات میں سٹالن ازم کا مکروہ جنم ہوا۔"ایک ملک میں سوشلزم" کے نظریئے نے تیسری انٹرنیشنل کو اصلاح پسندی اور قوم پرستانہ انحطاط کے راستے پر دھکیل دیا۔عالمی انقلاب کا ہراول دستہ بننے کی بجائے سٹالن اور اس کے حواریوں کے تحت انٹرنیشنل نے اپنے بہترین عناصر کو نکال باہر کیا اور محض سٹالن اسٹ افسر شاہی کی خارجہ پالیسی کا آلہ کار بن کر رہ گئی۔ان اقدامات کے نتیجے میں یکے بعد دیگرے ہونے والی تباہ کن شکستوں نے عالمی مزدور تحریک کو شل کر کے رکھ دیا۔چین، جرمنی، اسپین اور دیگر ممالک کے انقلابات افسر شاہی کی غداریوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔بالآخر 1943ء میں مغربی اتحادیوں کو خیر سگالی کا پیغام دینے کے لئے سٹالن نے باقاعدہ طور پر کمیونسٹ انٹرنیشنل کو تحلیل کر دیا۔آج سرمایہ داری کا بحران گہرا تر ہوتا جا رہا ہے اور انقلابی واقعات عہد کا معمول بن چکے ہیں۔1919-23ء کے عظیم دن ایک بار پھر زندہ ہو کر رہیں گے۔ایک نئی نسل کو ان ناقابلِ فراموش واقعات سے اسباق حاصل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ہمیں آنے والے واقعات کے لئے تیار ہونا ہے۔تیسری انٹرنیشنل کی روایات آج ہمارے جھنڈے پر آویزاں ہیں۔۔دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ!

صحرائے صحارا: سوڈان کا وہ مقام جو ماحولیاتی تبدیلی کے صدیوں پرانے راز چھپائے بیٹھا ہے

بی بی سی ٹریول

جب ہمارے پک اپ ٹرک نے شمال مشرقی سوڈان میں دریائے نیل سے مخالف سمت میں ایک کچی سڑک پر چلنا شروع کیا تو ہمارے سامنے افق لا متناعی تھا جس پر چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں نظر آتی تھیں۔ شاید وہ پہاڑ تھے یا ریت کے ٹیلے یا پھر سراب۔ اس سرزمین کی وسعت کا اندازہ لگانا مشکل ہے، بس صرف ایک چیز ہی یقینی ہے اور وہ ہے اس کا خالی پن۔ ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم ایک خشک دریا کی وادی میں پہنچے جہاں ریتلے پتھروں کی ایک قطار ہے۔ میں اپنی دنیا میں مگن دن کو خواب دیکھ رہا تھا جب ریڈیو پر سوڈان جیز موسیقی کی آواز نے مجھے جگا دیا اور چٹان پر موجود کسی جانور کا ایک سفید خاکہ میری توجہ کا مرکز بنا۔ میں نے سوچا کہ صحرا میرے ساتھ فریب کر رہا ہے لیکن جب ہم اس کے قریب رکے تو میرے سارے خدشات دور ہو گئے۔ چٹانوں پر ہزاروں سال پرانی نقاشی تھی جس میں ہاتھی، زرافے، شتر مرغ اور کشتیوں کی تصاویر کندہ تھیں۔ جب ہوا تیز چلی تو ریت بھی اڑنے لگی اور میرے سامنے ایسے مناظر آئے جو سرینگیٹی کے سرسبز و شاداب میدانوں اور آبی گزرگاہوں میں تو ٹھیک لگتے ہیں لیکن دریائے نیل اور بحیرہ احمر میں پھنسے اس لق و دق صحرا میں، میں یہ دیکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے جیسے آثار قدیمہ کے ماہر جو بحرہ اسود کی تہہ اور راکی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر کام کر چکا ہے وہ نئی جگہوں سے زیادہ حیران نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں نقاشی کے جو نمونے میرے سامنے آئے انھوں نے مجھے ششدر کر دیا۔ میری حالت کا اندازہ لگا کر میرے ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے کہا: سابو میں خوش آمدید، یہاں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ سوڈان کیسا ہوا کرتا تھا۔ سابو کے آثار قدیمہ کے مرکز میں 1500 سنگ نقاشی کے نمونے ہیں جن میں دس ہزار سال کی انسانی تاریخ سموئی ہوئی ہے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کو ابھی یہ طے کرنا ہے کہ قدیم نوبیئن باشندوں نے کب پتھروں کو تراش کر یہ نقوش بنائے تھے۔ لیکن ایک چیز بہت واضح ہے کہ قدیم تاریخ کا یہ ورثہ اچھی طرح محفوظ ہے اور دریائی گھوڑے، مگرمچھ اور کشتیوں کی تصاویر ایک ایسی دنیا کی تصویر دکھاتی ہے جو موجودہ صحرا کے حالات زندگی سے بلکل مختلف ہے۔ آثار قدیمہ کے ماہر ڈاکٹر بروس ولیئم 50 برسوں سے سوڈان میں کام کر رہے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ سابو میں بہت تنوع ہے۔ یہاں قدیم وقتوں کے جانور بھی ہیں اور کرما دور (2600-1450 قبل از مسیح) کے مویشی بھی۔ مصری کی نئی سلطنت سابو کی یہ سنگ تراشی اپنے اندر چھپی ہوئی تاریخ کے علاوہ اپنے اندر انسان کے خود کو حالات کے ساتھ ڈھالنے کی تاریخ کو بھی سنبھالے ہوئے ہے۔ آثار قدیمہ کا یہ مرکز بتاتا ہے جب سوڈان کی سرسبز وادیاں لق و دق صحرا میں بدلیں تو انسان نے خود کو حالات سے کیسے ہم آہنگ کیا۔ ایک وقت صحرائے اعظم صحارا کا موسم اس کے موجودہ موسم سے بلکل مختلف تھا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ صحرائے صحارا بیس سے تیس لاکھ سال پرانا ہے جب مرکزی افریقہ سے اٹھنے والی مون سون کی ہوائیں یہاں بارش برساتی تھیں، جس سے دریائے نیل میں طغیانی آتی اور اس سے دوسرے ندی نالوں میں پانی پہنچتا جن سے موجودہ کینیا اور تنزانیہ جیسے لہلاتے میدان ہوتے تھے جہاں ہاتھیوں اور ہرنیوں کے ریوڑ گھوما کرتے تھے۔ وسیع جنگلوں اور جانوروں کی وجہ سے اس علاقے میں گھومنے والے انسانوں کے لیے کھانے پینے کے کافی وسائل تھے۔ سابو کی چٹانوں میں سینکڑوں جانور کی تصاویر اس بھولے بسرے دور کی نشانی ہیں۔ صحرائے صحارا کے سب سے پُرانے نقوش کو بابالائن زمانے سے منصوب کیا جاتا ہے۔ صابو وہ واحد جگہ نہیں ہے جہاں

نوبین صحرا دریائے نیل اور بحرہ احمر کے مابین اور صحرائے اعظم کے مشرق میں واقع ہے

آثار قدیمہ کے ایسے نقوش موجود ہیں، البتہ یہ سوڈان میں پہلی جگہ ہے جسے آثار قدیمہ کے برطانوی ماہر نے 1940 میں محفوظ کیا ہے۔ ڈاکٹر ولیم کہتے ہیں کہ نوبیا اور اس کے ملحقہ صحراؤں میں نقوش کا بہت خزانہ موجود ہے، ایسی چٹانیں جہاں سرنگیں بھی ہیں، ان میں بہت شاندار سنگ تراشی کے انتہائی شاندار نمونے موجود ہیں لیکن سابو میں آثار قدیمہ کسی ایک ملک میں موجود آثار قدیمہ سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہاں قدیم فن اور دوسری معلومات کے علاوہ انسانوں کے جانوروں کے ساتھ تعلقات کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ سابو کے قریب ہی ہونے والی ایک کھدائی میں انسان کے ہاتھوں مارے گئے وارتھاگ، تیندوے، بڑی چھپکلیوں، مچھلی، ہرن اور زرافے کی ہڈیاں چولہوں کے قریب پڑی ہوئی ہیں، جہاں شکار کے لیے پتھروں سے بنائے گئے ہتھیار بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ سابو میں شکار کی یہ شہادتیں اس دور کا بتاتی ہیں جب شمالی افریقہ کے ہرے بھرے میدانوں میں زندگی وافر مقدار میں تھی۔ لیکن اسے ہمیشہ کے لیے نہیں رہنا تھا اور 5500۔5000 قبل از مسیح جب دو ہزار سالوں پر محیط ماحولیاتی تبدیلی کا آغاز ہوا اور پھر افریقن ہیومڈ پیریڈ آہستہ آہستہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ جوں جوں میں نے سابو کے ان نقوش کو دیکھا تو مجھے افریقی جانوروں میں گائے بھی نظر آئی۔ گائے کی آمد دراصل ایک نئے دور کا آغاز ہے جسے انسانی تاریخ میں بویڈین فیز کے نام سے جانا جاتا ہے۔ گائے کی موجودگی اس معاشرتی تبدیلی کی نشانی ہے جو سات ہزار سال پہلے ماحول کی تبدیلی کے ساتھ آنا شروع ہوئی تھی۔ جوں جوں شمالی افریقہ میں مون سون بارشوں کے سلسلوں میں تبدیلی آنے لگی علاقے کے مرطوب موسم پہلے سے مختصر ہونے لگے۔ ان حالات میں انسانوں اور جانوروں نے دریائے نیل کے قریبی علاقوں کی طرف ہجرت کرنا شروع کی۔ جوں جوں موسم خشک ہوتا گیا، موطوب موسمی دور کا اختتام ہو گیا اور 3500 قبل از مسیح میں وہ صحرا وجود میں آیا جیسا آج ہم دیکھتے ہیں۔ شاید بدلتے ہوئے موسمی حالات کی وجہ سے خانہ بدوش شکاری ایک جگہ پر رہنے لگے اور انھوں نے گائے، بھیڑ اور بکری جیسے جانوروں پر انحصار کرنا شروع کر دیا۔ اس سے ایک معاشرتی تبدیلی رونما ہوئی اور مویشیوں کو چروانے کا دور شروع ہوا جسے نیولتھک دور کا آغاز بھی کہا جاتا ہے۔ اس دور میں آگے چل کر مستقل انسانی بستیاں، قصبے تعمیر ہوئے اور پھر بادشاہت کا آغاز ہوا۔ اسی دور میں گائے کی اہمیت میں بے تحاشا اضافہ ہوا اور وہ سوڈان کی تجارت اور معیشت کا اہم جز بن گئی۔ سوئٹزرلینڈ کے ماہر آثار قدیمہ جیروم ڈوبسن کے خیال میں سابو میں گائے کے نقوش کی بہتات سوڈان میں اس جانور کی اہمیت سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ مثال کے طور پر قدیم خوشائٹ بادشاہت کے مرکز کرما میں ہزاروں جانوروں کی کھوپڑیاں 2000 قبل مسیح میں ایک مقبرے سے ملی ہیں۔ چٹانوں پر نقوش اور دوسری کھدائیوں سے معیشت کی تبدیلی اور بدلتے ہوئے موسمی حالات میں لوگوں کا حالات سے خود کو ہم آہنگ ہونے کا پتا چلتا ہے۔ آگے چل کر یہ نیا اندازِ زندگی شمالی افریقہ کے تمام معاشروں کی خصوصیت بن گیا جو سوڈان کی خشوعیت بادشاہت اور مصر کے فرعونوں کے عروج وزوال سے زیادہ عرصہ افریقی معاشرے کا حصہ رہا ہے۔ گلہ بانی سوڈان کی زندگی کا اہم حصہ ہے۔ حسانیا اور بشارن جیسے خانہ بدوش قبائل آج بھی بارانی علاقوں میں اپنے گائیوں، بھیڑیوں، بکریوں اور اونٹوں کے ریوڑوں کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں۔ سوڈان کے نوبین خانہ بدوشوں میں سنگی نقوش کے فن کی آج بھی اہمیت برقرار ہے اور کبھی کبھار کاروں اور بسوں پر بھی قدیم آرٹ کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سابو ایک ہزار سال علاقے کی ڈائری میں اپنی اہمیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ لیکن صحارا میں ایک اور موسمی تبدیلی آرہی ہے جو لوگوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔ سابو کا دورہ کرنے کے چند روز بعد میں جب درختوں کی ٹہنیوں سے بنی ایک جھونپڑی میں بیٹھا حسانیا قبیلے کی 98 سالہ مدینا سے بات کر رہا تھا، تو مجھے معلوم ہوا کہ صحارا میں کون سی موسمی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ مدینا مجھے شمالی سوڈان کے صحرا میں گزری اپنی زندگی کے حالات سنا رہی تھی۔ مدینا کو یاد ہے کہ جب انگریز ان کے قبیلے سے ٹیکس مانگنے آئے تھے۔ انھیں یاد ہے کہ جب پہلی بار ملک میں سڑکیں بنیں تو کئی قبائل خانہ بدوشی کی زندگی کو ترک کر کے مستقل گھروں میں رہنے لگے۔ جب میں نے مدینا سے پوچھا کہ وہ کیا سمجھتی ہیں کہ شمالی سوڈان کا مستقبل کیا ہے، تو انھوں نے پہلے سے زیادہ بارشوں کی بات کی۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ انھوں نے اور ان کے خاندان نے موسموں میں تبدیلی کو محسوس کیا ہے اور انھیں نہیں معلوم کہ ماحولیاتی تبدیلیاں ان کو کیسے متاثر کریں گی۔ میں صحرا میں ایک جھونپڑی میں بیٹھا حیرانی سے اس بوڑھی خانہ بندوش عورت کی باتیں سن رہا تھا جو خبروں اور ذرائع ابلاغ سے دور صحرائے اعظم کے ایک کونے میں زندگی گذار رہی ہے اس نے بھی ماحولیاتی تبدیلی کو محسوس کیا اور انسانوں پر اس کے اثرات کے بارے ان کے خدشات ہیں۔

جب ہمارا پک اپ ٹرک ان جھونپڑوں سے نکل کر بائیودا صحرا کی طرف جارہا تھا تو مجھے مدینا کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ جس طرح ہزاروں سالوں سے ہوتا ہے کہ صحرا اپنے دامن میں بسنے والوں کی زندگیوں اور ثقافتوں کو اپنے انداز میں ڈھال رہا ہے۔ میں گاڑی کی کھڑکی سے باہر گھورتے ہوئے اس سرزمین کی وسعت کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا سابو کی ڈائری میں اب پتھروں پر کون سے نقوش کو کندہ کیا جائے گا جس سے مستقبل کے مسافر موجودہ دور کی کہانیاں جان سکیں گے۔ (بشکریہ بی بی سی)

پھٹی ہوئی شلوار اور ٹک ٹاک کا "پرینکستان"

تحریر: الیاس بابر اعوان

ٹک ٹاک چین کی ایک بین الاقوامی کمپنی ByteDance کی ملکیت ہے۔ بنیادی طور پر یہ موبائل فون میں استعمال ہونے والا ایک سافٹ ویئر ہے جس کو انسٹال کر کے آپ مختصر دورانیے کا رقص، اپنا ٹیلنٹ، گانوں پر لِپ سنک یا مزاحیہ ویڈیو بنا کر شیئر کرتے ہیں۔ ٹک ٹاک کے مالک کے نام Zhang Yiming ہے جس کی عمر محض 37 برس ہے۔ ژینگ نے بائٹ ڈانس نامی کمپنی 2012 میں قائم کی اور Toutiao کے نام سے ایک پلیٹ فارم قائم کیا جس کا بنیادی مقصد لوگوں کو معلومات اور خبریں فراہم کرنا تھا۔ دو ہزار سترہ سے روزانہ کے لحاظ سے اس کے ایک سو بیس ملین صارفین ریکارڈ ہو رہے ہیں۔ اس کی نیٹ ویلیو بیس بلین امریکی ڈالرز یعنی/ 3,217,938,000,000 پاکستانی روپے بنتی ہے۔ بائٹ ڈانس نے 9 نومبر 2017ء کو ٹک ٹاک نے نام سے ویڈیو شیئرنگ پروگرام بنایا۔ نومبر 2018 میں ٹک ٹاک کے روزانہ کی بنیاد پر 800,000,000 یعنی اسی کروڑ صارفین ہو گئے۔ کمپنی نے ایک اور کمپنی Musical۔ly کے ساتھ شراکت داری کر لی۔ اس وقت دنیا کے ہر بڑے ملک میں ان کمپنیوں کے دفاتر موجود ہیں۔ 2020ء کے اعداد و شمار کے مطابق بائٹ ڈانس کے اثاثہ جات مئی کے مہینے تک ۔/ 2,067,267,500,000 پاکستانی روپے تھے جب کے ژینگ کی ذاتی دولت ۔/ 2,606,529,780,000 پاکستانی روپے بتائی جاتی ہے۔ ٹک ٹاک دنیا میں بہت مقبول ایپ ہے۔ دنیا کی پینتالیس فی صد آبادی سوشل میڈیا استعمال کرتی ہے۔ جنوری 2020ء کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ استعمال کیا جانے والی سماجی رابطے کی سائٹ فیس بک ہے جس کے صارفین کی تعداد 2449000000 یعنی اڑھائی ارب کے کچھ کروڑ کم۔

دوسرے نمبر یوٹیوب کے صارفین ہیں جو دو ارب سے کچھ زائد ہیں۔ تیسرے نمبر پر وٹس ایپ جس کے صارفین ایک ارب ساٹھ کروڑ جب کہ ٹک ٹاک کے صارفین کی تعداد دنیا بھر میں 800,000,000 یعنی اسی کروڑ سے کچھ زائد ہے۔ جب کہ سماجی رابطوں کی سائٹس کی ترتیب میں ٹک ٹاک کا نمبر چھٹا ہے۔ تاہم آڈینس Engagement کی شرح کے لحاظ سے 2019ء میں پہلے نمبر پر انسٹا گرام، دوسرے پر ٹک ٹاک اور تیسرے نمبر پر ٹویٹر رہے۔ چین میں ٹک ٹاک کے چالیس کروڑ صارفین موجود ہیں۔ چین سے باہر دنیا میں سب سے زیادہ ٹک ٹاک کے صارفین بھارت میں تقریباً بارہ کروڑ، دوسرے نمبر پر امریکہ جہاں اس کے صارفین کی تعداد ساڑھے تین کروڑ، تیسرے نمبر ترکی جہاں تقریباً اڑھائی کروڑ، چوتھے پر روس جہاں پر اڑھائی کروڑ کے قریب، پانچویں پر میکسیکو، چھٹے پر برازیل اور ساتویں پر پاکستان جہاں پر ٹک ٹاک کے صارفین کی تعداد ایک کروڑ اٹھارہ لاکھ کر قریب ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ ٹک ٹاک کے فالورز Amelio Charli D' کے ہیں جن کا تعلق امریکہ سے ہے۔ ان کے فالوورز کی تعداد 6 کروڑ ہے۔ یاد رہے کہ یہ محترمہ ٹک ٹاک پر اپنے رقص کے ویڈیوز شیئر کرتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ ایک ویڈیو کے پچیس ہزار امریکی ڈالرز لیتی ہیں جو پاکستانی کرنسی میں 4,022,422 روپے بنتے ہیں [واللہ اعلم بالصواب]۔ محترمہ کے اثاثہ جات کے متعلق بتایا جاتا ہے چالیس لاکھ امریکی ڈالرز سے زائد ہیں۔ دوسرے نمبر پر امریکی گلوکارہ Loren Gray ہیں جن کے فالوورز کی تعداد چار کروڑ تیس لاکھ کے قریب ہے۔ اس کے بعد نمبر آتا ہے Zach King کا یہ بھی امریکہ سے تعلق رکھتے ہیں اس شخص کو آپ میں سے بہت سے لوگوں نے دیکھا ہوگا اس کے ویڈیوز کو magic vines کہا جاتا ہے۔ آپ نے اکثر ویڈیوز دیکھیں

ہوں گے یہ نوجوان بادل کو ہاتھ سے پکڑتا ہے تو وہ کاٹن کینڈی بن جاتا ہے۔ لیپ ٹاپ کی سکرین پر سنگترے کا جوس پھینکتا ہے تو وہ لیپ ٹاپ کی سکرین میں نظر آ رہے کسی شخص کے سر پر گرتا دکھائی دیتا ہے اور اس قسم کے بیسیوں معروف ویڈیوز اس کے فالوورز کی تعداد بھی لورین گرے کے قریب قریب مگر کچھ کم ہے۔ پاکستان میں ٹک ٹاک کے سب سے زیادہ فالوورز محترمہ جنت مرزا کے بتائے جاتے ہیں، جن کی تعداد چھیالیس لاکھ ہے۔ ان کی عمر بیس برس ہے اور تعلق فیصل آباد سے ہے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ میں نے ان کے ایک انٹرویو میں سنا تھا کہ انہیں ایک ویڈیو اپ لوڈ کرنے کے پچیس ہزار روپے ملتے ہیں [واللہ اعلم بالصواب]۔ دوسرے نمبر پر قبلہ ذوالقرنین سکندر ہیں جن کے چاہنے والوں کی تعداد تقریباً اڑتیس لاکھ ہے۔ محترمہ پنکی فرانسس کا نمبر تیسرا ہے، جن کے پیروکاروں کی تعداد تقریباً ستائس لاکھ ہے۔ آپ کا قیام دبئی میں ہے۔ تاہم کچھ اداکاروں اور اداکاراوں کے چاہنے والوں کی بھی تعداد لاکھوں میں ہے جیسے نورحسن پاکستانی اداکار ہیں، ان کے چھہتر لاکھ فالوورز ہیں جب کہ دوسرے نمبر یاسر حسین جن کے بتیس لاکھ فالوورز بتائے جاتے ہیں۔ [یاد رہے پاکستانی ٹک ٹاکرز کے بارے میں معلومات غیر محتاط ہیں۔ مختلف جگہوں پر مختلف اعداد و شمار ہیں لہذا غلطی کی گنجائش ہے]۔ سوال یہ ہے ٹک ٹاک کیوں استعمال کیا جاتا ہے؟ اس کی مختلف وجوہ میں سے ایک سب سے بڑی وجہ یقیناً پیسے کمانا ہے [ٹک ٹاک سے پیسے کیسے کمائے جاتے ہیں اس کے بارے میں میری معلومات صفر ہیں]۔ تاہم یہ تمام لوگ جنہیں اب Influencers کا نام دے دیا گیا ہے۔ اب ایک متوازی سٹارڈم کا مزا چکھ رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ پیسے کمانے والی امریکی ٹک ٹاکر محترمہ Charli'D Amelio کو آفر کی جاتی ہے کہ فلاں گانے پر رقص کیا جائے اور انہیں اس مقصد کے لیے بھاری رقم بھی پیش کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے ان کو خاص لباس پہننے کا بھی کہا جاتا ہوگا، جس کے لیے الگ سے رقم دی جاتی ہو گی۔ لوگ ان Influencers کو دیکھتے ہوں گے اور ویسا بننے اور کرنے کی کوشش میں مارکیٹ سے وہ مصنوعات خریدتے ہوں گے۔

تاہم میں نے کچھ دن ٹک ٹاک کا [انتہائی] گہرا مطالعہ کیا [جس نے مجھ پر خاصے خوش گوار اثرات ڈالے] یہاں بڑے دلچسپ لوگ موجود ہیں۔ مثلاً ایک محترمہ خاصی مذہبی نوعیت کی ہیں کہ وہ رقص فرماتی ہیں لیکن کیمرے کی طرف چہرہ شریف نہیں کرتیں تاہم رقص سے جو کوئی ان کے بارے میں غیر شریفانہ اندازہ لگانا چاہتا ہے، اسے یوں بھی سوچنا چاہیے کہ دوران رقص محترمہ اپنی روایات کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں اور کبھی بھی غیر مرد کی طرف چہرہ شریف نہیں کیا۔ خیر ایک اور محترمہ ہیں جو باقاعدہ مختلف رنگوں کے برقعے پہن کر رقص فرماتی ہیں اور کبھی بھی انہوں نے نقاب چہرے سے نہیں اتارا۔ کچھ ایسی خواتین ہیں جنہیں شاید کیمرا مین بتانا بھول جاتا ہے کہ آپ کی قمیص مبارک اس طرف سے بدپرہیزی کر رہی ہے یا اس طرح اپنے فالورز سے خطاب کرتے ہوئے جھکنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور حیرت کی بات ہے کوئی کسی کو یہ بھی نہیں بتاتا کہ پھٹی ہوئی شلوار پر پیوند لگایا جاتا ہے نہ کہ ایک خاص زاویے سے فلم بند کی جاتی ہے۔

کچھ شرارتی کیمرا مین خواتین کو پاؤں سے دکھانا شروع کرتے ہیں لیکن چہرے سے قبل جا کر رک جاتے ہیں شاید محترمہ کی حیا آڑے آ جاتی ہو۔ میں نے ایک چیز اور نوٹ کی کہ زیادہ تر ویڈیوز چھتوں پر بنائے گئے ہیں، جہاں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا ایسی خواتین کی معاشی اور سماجی حالت کیا ہے۔ کچھ خواتین ایلیٹ کلاس کی دکھائی دیتی ہیں۔ ایک بہت پر لطف تجربہ ہوا کہ ایک آئی ڈی پر خواتین کی ایک خاص انداز سے فلم بندی کی گئی اور آخر میں ہر ویڈیو پر لکھا ہوا ابھرتا "ویکھو کنی بے حیائی اے پاکستانی چ اللہ ایہناں نوں ہدایت دووے"۔ موصوف خاصے دردمند واقع ہوئے یہ پیغام انہوں نے مکمل ویڈیوز دکھا کر دیا تاکہ سند دے۔ دوسری طرف ٹک ٹاک پر دو قسم کے مرد پائے جاتے ہیں ایک وہ جو ظاہراً مرد ہی دکھائی دیتے ہیں اور دوسرے وہ جو شاید مرد بننے کے عمل سے گزر رہے ہیں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کس وقت یہ موصوف مرد سے عورت بن جائیں۔ ٹک ٹاک پر ہمارے اداکاروں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو اپنے اختراع شدہ سکرپٹ کے مطابق ویڈیوز بنا کر زیادہ سے زیادہ لائیکس حاصل کرنے کے خواہش مند دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ٹک ٹاکرز ہر نئے سیاسی اور سماجی منظرنامے کو عکس بند کرتے ہیں اور مزاح یا دکھی انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ ایک اکیلے بندے کا کام نہیں اس تمام "تعلیمی" سرگرمی کے پیچھے ان کی ایک ٹیم ہوتی ہوگی۔ بہر حال سنا ہے کہ ایک بڑی سیاسی شخصیت نے ان ٹک ٹاکرز کو اپنے ہاں مدعو کیا اور انہیں کرونا کے خلاف جنگ لڑنے میں اپنا کردار ادا کرنے کا کہا گیا ہے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ وہ کتنا پر اثر کردار

ادا کریں گے لیکن ایک بات طے ہے کہ ان کے فالوورز زیادہ ہو جائیں گے اور ان کے ویڈیوز کی قیمت بڑھ جائے گی۔ بالکل ایسے ہی جیسے میرے اس کالم کے بعد تمام قارئین اس کالم میں مذکورہ لوگوں کے ٹک ٹاک پر جا کر ان کو ایک بار ضرور دیکھیں گے۔ [شاید ٹک ٹاک پر مجھے بھی فالورز مل جائیں]۔ کچھ ماہ قبل مجھے ایک ادارے کے نمائندے کا خطبہ سننے کو ملا جس میں انہوں نے بتایا کہ گاڑی چلاتے ہوئے احتیاطی تدابیر کیا برتنی چاہیں۔ جب وہ تمام بات کر چکے تو میں نے عرض کی حضرت کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس عمر میں جب ہماری عادات پختہ ہوگئیں ہیں ہم لیکچر سن کر سیکھ لیں گے۔ گاڑی چلانا ایک مشق ہے اور عادات بد کے خاتمے کے لیے اسے مشق کے ذریعے سے ہی ختم کرنا ہوگا۔ دوسری بات کیا ہی اچھا ہو آپ یہ بات بچوں کے نصاب میں کہانیوں کی صورت میں شامل کروائیں۔ کچھ کارٹون پروگرامز میں ان موضوعات کا شامل کریں۔ ان پر کچھ ڈرامے اور فلمیں بنوائیں جن میں حادثے اور اس کے اثرات کو بہتر اور پر اثر انداز میں پیش کریں تو وہ حضرت خاموش ہوگئے اور اس کے بعد مجھے ابھی تک کچھ ایسا دکھائی نہیں دیا جس سے ثابت ہوا ہو کہ کچھ بہتر ہوا ہے۔ بالکل ایسے ہی موجود حکومت نے پاکستان کو پرینکستان بنا دیا ہے یہ عوام کے ساتھ مذاق کر رہی ہے جب آپ کا بیانیہ کرونا کے خلاف لڑنے کا ہو ڈرنے کا نہ ہو تو عوام نہیں ڈرے گی۔ کرونا سے متعلق ایک ڈرامہ بھی کسی چینل پر پیش نہیں کیا گیا، یاد رہے روز رٹا رٹایا ہوا جملہ کلیشے بن کر بے معنی ہو جاتا ہے۔ آپ نے ٹک ٹاکرز کو بلا لیا لیکن کسی پروفیسر، کسی میڈیا کے دماغ، کسی شاعر ادیب، کسی بلاگر، کسی موسیقار، کسی کارٹونسٹ کو نہیں بلایا کہ کرونا کے خلاف کوئی تخلیقی سطح پر چیز سامنے لائیں جو لوگوں کو بتا سکے کہ کرونا کے خلاف کیسے احتیاطی تدابیر کرنی ہیں۔ پچھلے دنوں ایک امریکی سیاست دان نے اپنا رونا ان الفاظ میں رویا کہ "امریکہ گزشتہ کچھ برس سے نادان لیڈرشپ کا شکار رہا ہے"۔ ان تک سید مظہر مسعود کے اس شعر کی شکل میں یہ پیغام پہنچا دیا جائے کہ:

ہمارے غم تمہارے غم برابر ہیں
سو اس نسبت سے تم اور ہم برابر ہیں

❁❁❁

ماں باپ

تحریر: حافظ اسد اللہ وحید۔ سیرالیون

رات پچھلے پہر خود بخود رو پڑا خواب آتے رہے آج پھر دیر تک
سِسکیاں تھیں کہ رکنے سے قاصر رہیں غم دباتے رہے آج پھر دیر تک

والد محترم دلرُبا خیر خواہ والدہ نیک سیرت خدا کی عطا
اِن بزرگوں کی یادوں کو محرابِ دل میں سجاتے رہے آج پھر دیر تک

ڈانٹ میں پیار تھا لاڈ میں دلکشی، آج ان نعمتوں کی بہت پیاس ہے
خشک تالو سے قلبِ حزیں کو مگر خوں پلاتے رہے آج پھر دیر تک

دل بھی نادان ہے کہہ رہا تھا میسر نہیں گود ماں کی بڑی دیر سے
اب بڑے ہو چکے ہو یہ احساس دل کو دلاتے رہے آج پھر دیر تک

اُن کی شفقت کا سایہ میرے سنگ تھا دل کی دنیا کا بالکل الگ رنگ تھا
اشک دل میں اتر کر میری پشت کو تھپتھپاتے رہے آج پھر دیر تک

زندگی کی سجاوٹ کے اسباب میں ہاتھ شامل ہے بیشک بزرگان کا
ان بزرگان کی محنتوں کے قصیدوں کو گاتے رہے آج پھر دیر تک

سچ کہا ہے کسی نے بزرگان گھر کے نبی ہیں یہ احساس تھا اس لئے
بعثتِ دوم کی آس دل میں لئے گڑگڑاتے رہے آج پھر دیر تک

دائیں بائیں نہ آگے نہ پیچھے کوئی مشورہ جن سے کرنا تھا ہم میں نہیں
ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی یہ نظر سر کھجاتے رہے آج پھر دیر تک

تھے خدا کی امانت خدا کے حوالے خدا کی کفالت کے طالب سبھی
دامنِ صبر تھامے غضنفرؔ تسلّی سی پاتے رہے آج پھر دیر تک

❁❁❁

وہ اشعار جو علامہ اقبال کے نہیں ہیں مگر اُن کے نام سے منسوب ہیں

شعبہ گوشۂ ادب

ہم سب چونکہ گلوبل ورلڈ سے وابستہ لوگ ہیں اور انٹرنیٹ کی دُنیا میں اور بالخصوص فیس بُک پر علامہ اقبال کے نام سے بہت سے ایسے اشعار گردِش کرتے ہیں جن کا اقبال کے اندازِ فکر اور اندازِ سُخن سے دُور دُور کا تعلق نہیں۔ کلامِ اقبال اور پیامِ اقبال سے محبت کا تقاضا ہے اور اقبال کا حق ہے کہ ہم ایسے اشعار کو ہرگز اقبال سے منسوب نہ کریں جو اقبال نے نہیں کہے۔ ذیل میں باقاعدہ گروہ بندی کر کے ایسے اشعار کی مُختلف اقسام اور مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

1۔ گروہ اول:

پہلی قِسم ایسے اشعار کی ہے جو ہیں تو معیاری اور کِسی اچھے شاعر کے مگر اُنہیں غلطی سے اقبال سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ ایسے اشعار میں عموماً عُقاب، قوم اور خودی جیسے الفاظ کے استعمال سے قاری کو یہی لگتا ہے کہ شعر اقبال کا ہی ہے۔

مثال کے طور پہ:

تُندیِ بادِ مُخالف سے نہ گھبرا اے عُقاب
یہ تو چلتی ہے تُجھے اُونچا اُڑانے کے لیے

سید صادق حُسین

اِسلام کے دامن میں اور اِس کے سِوا کیا ہے
اِک ضرب یدّ اللہ اِک سجدۂ شبیری

وقار انبالوی

خُدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جِس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ظفر علی خان

2۔ گروہِ دوئم:

پھر ایسے اشعار ہیں جو ہیں تو وزن میں مگر الفاظ کے چُناؤ کے لحاظ سے کوئی خاص معیار نہیں رکھتے یا کم از کم اقبال کے معیار/ اسلوب کے قریب نہیں ہیں۔

مثالیں:

عِشق قاتِل سے بھی مقتول سے ہم دردی بھی
یہ بتا کِس سے محبت کی جزا مانگے گا؟
سُجدہ خالِق کو بھی ابلیس سے یارانہ بھی
حشر میں کِس سے عقیدت کا صِلہ مانگے گا؟

سرفراز بزمی

تِری رحمتوں پہ ہے مُنحصر میرے ہر عمل کی قبولیت
نہ مُجھے سلیقۂ اِلتجا، نہ مُجھے شعورِ نماز ہے

نامعلوم

سُجدوں کے عِوض فِردوس مِلے، یہ بات مُجھے منظور نہیں
بے لوث عِبادت کرتا ہوں، بندہ ہُوں تِرا، مزدور نہیں

نامعلوم

3۔ گروہِ سوئم:

بعض اوقات لوگ اپنی بات کو مُعتبر بنانے کے لیے واضح طور پر مَن گھڑت اشعار اقبال سے منسوب کر دیتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار غالباً شِدت پسندوں کی جانِب سے شِدت پسندوں کے خِلاف اقبال کے پیغام کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔

مثلاً ایسے اشعار:

اللہ سے کرے دُور تو تعلیم بھی فِتنہ
املاک بھی اولاد بھی جاگیر بھی فِتنہ
ناحق کے لیے اُٹھے تو شمشیر بھی فِتنہ
شمشیر ہی کیا نعرۂ تکبیر بھی فِتنہ

نامعلوم

4۔ گروہِ چہارم:

اِسی طرح اقبال کو اپنا حمایتی بنانے کی کوشش مُختلف مذہبی و مسلکی جہتوں سے بھی کی جاتی ہے جب کہ اِن کا اقبال سے دُور دُور تک کوئی تعلق بھی نہیں ہے بلکہ افکارِ اقبالؒ سے ظُلم ہے۔ مثلاً:

وہ روئیں جو مُنکر ہیں شہادتِ حسین کے
ہم زندہ وجاوید کا ماتم نہیں کرتے

نامعلوم

بیاں سِرِ شہادت کی اگر تفسیر ہو جائے
مُسلمانوں کا کعبہ روضۂ شبیر ہو جائے

نامعلوم

نہ عِشقِ حُسین نہ ذوقِ شہادت
غافِل سمجھ بیٹھا ہے ماتم کو عبادت

نامعلوم

5۔گروہ پنجم:

پانچواں گروپ "اے اقبال" قِسم کے اشعار کا ہے جن میں عموماً اِنتہائی بے وزن اور بے تکی باتوں پر اِنتہائی ڈھٹائی سے "اقبال" یا "اے اقبال" وغیرہ لگا کر یا اِس کے بغیر ہی اقبال کے نام سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ اِس قِسم کو پہچاننا سب سے آسان ہے کیوں کہ اِس میں شامل "اشعار" دراصل کِسی لحاظ سے بھی شعری معیار نہیں رکھتے اور زیادہ تر اشعار کہلانے کے لائق بھی نہیں ہیں۔ مثالیں:

کیوں منّتیں مانگتا ہے اوروں کے دربار سے اقبال
وہ کون سا کام ہے جو ہوتا نہیں تیرے پروردگار سے؟

تیرے سُجدے کہیں تُجھے کافر نہ کر دیں اقبال
تُو جُھکتا کہیں اور ہے اور سوچتا کہیں اور ہے

دل پاک نہیں ہے تو پاک ہو سکتا نہیں انساں
ورنہ ابلیس کو بھی آتے تھے وضو کے فرائض بہت

مسجِد خُدا کا گھر ہے پینے کی جگہ نہیں
کافِر کے دل میں جا وہاں خُدا نہیں

کرتے ہیں لوگ مال جمع کِس لیے یہاں اقبال
سِلتا ہے آدمی کا کفن جیب کے بغیر

میرے بچپن کے دِن بھی کیا خوب تھے اقبال
بے نمازی بھی تھا بے گناہ بھی

وہ سُو رہا ہے تو اُسے سُونے دو اقبال
ہوسکتا ہے غُلامی کی نیند میں وہ خوابِ آزادی کے دیکھ رہا ہو

گُونگی ہو گئی آج زُباں کُچھ کہتے کہتے
ہچکچا گیا میں خُود کو مُسلماں کہتے کہتے

یہ سُن کہ چُپ سادھ لی اقبال اُس نے
یُوں لگا جیسے رُک گیا ہو مُجھے حیواں کہتے کہتے

اُمید ہے یہ کاوش فیس بُک کی دُنیا سے وابستہ احباب کے لیے علامہ مُحمد اقبال سے منسوب غلط اشعار کی روک تھام میں اپنی محنت برابر درجہ ضرور پائے۔

(ازمنقول)

ناصر کاظمی

سفرِ منزلِ شب یاد نہیں
لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں

اولیں قرب کی سرشاری میں
کتنے ارماں تھے جو اب یاد نہیں

دل میں ہر وقت چبھن رہتی تھی
تھی مجھے کس کی طلب یاد نہیں

وہ ستارہ تھی کہ شبنم تھی کہ پھول
ایک صورت تھی عجب یاد نہیں

کیسی ویراں ہے گذر گاہِ خیال
جب سے وہ عارض و لب یاد نہیں

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار
یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں

ایسا الجھا ہوں غمِ دنیا میں
ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں

رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

یہ حقیقت ہے کہ احباب کو ہم
یاد ہی کب تھے جو اب یاد نہیں

یاد ہے سیرِ چراغاں ناصر
دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں

تحریر: ابن انشا

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو کیا انشاؔ جی سودائی ہیں

ہیں لاکھوں روگ زمانے میں کیوں عشق ہے رسوا بے چارا
ہیں اور بھی وجہیں وحشت کی انسان کو رکھتیں دکھیارا
ہاں بے کل بے کل رہتا ہے ہو پیت میں جس نے جی ہارا
پر شام سے لے کر صبح تلک یوں کون پھرے گا آوارہ
یہ باتیں جھوٹی باتیں یہ لوگوں نے پھیلائیں ہیں

تم انشاؔ جی کا نام نہ لو کیا انشاؔ جی سودائی ہیں
یہ بات عجیب سناتے ہو وہ دنیا سے بے آس ہوئے
اک نام سنا اور غش کھایا اک ذکر پہ آپ اداس ہوئے
وہ علم میں افلاطون سنے وہ شعر میں تلسی داس ہوئے
وہ تیس برس کے ہوتے ہیں وہ بی اے ایم اے پاس ہوئے

یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو کیا انشاؔ جی سودائی ہیں
گر عشق کیا ہے تب کیا ہے کیوں شاد نہیں آباد نہیں
جو جان لیے بن ٹل نہ سکے یہ ایسی بھی افتاد نہیں
یہ بات تو تم بھی مانو گے وہ قیسؔ نہیں فرہاد نہیں

کیا ہجر کا دارو مشکل ہے کیا وصل کے نسخے یاد نہیں
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو کیا انشاؔ جی سودائی ہیں
وہ لڑکی اچھی لڑکی ہے تم نام نہ لو ہم جان گئے
وہ جس کے لمبے گیسو ہیں پہچان گئے پہچان گئے

ہاں ساتھ ہمارے انشاؔ بھی اس گھر میں تھے مہمان گئے
پر اس سے تو کچھ بات نہ کی انجان رہے انجان گئے
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں یہ لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو کیا انشاؔ جی سودائی ہیں
جو ہم سے کہو ہم کرتے ہیں کیا انشاؔ کو سمجھانا ہے

اس لڑکی سے بھی کہہ لیں گے گو اب کچھ اور زمانا ہے
یا چھوڑیں یا تکمیل کریں یہ عشق ہے یا افسانا ہے
یہ کیسا گورکھ دھندا ہے یہ کیسا تانا بانا ہے
یہ باتیں کیسی باتیں ہیں جو لوگوں نے پھیلائی ہیں
تم انشاؔ جی کا نام نہ لو کیا انشاؔ جی سودائی ہیں

جاں نثار اختر کی ایک خوبصورت غزل

لگتا ہے کہ تُم ہو

آہٹ سی کوئی آئے تو، لگتا ہے کہ تُم ہو
سایہ کوئی لہرائے تو ، لگتا ہے کہ تُم ہو
جب شاخ کوئی ہاتھ لگاتے ہی چمن میں
شرمائے، لچک جائے تو ، لگتا ہے کہ تُم ہو
صندل سے مہکتی ہوئی پُر کیف ہوا کا
جھونکا کوئی ٹکرائے تو ، لگتا ہے کہ تُم ہو۔
اوڑھے ہوئے تاروں کی چمکتی ہوئی چادر
ندی کوئی بل کھائے تو ، لگتا ہے کہ تُم ہو
جب رات گئے کوئی کرن میرے برابر
چُپ چاپ سی جائے تو ، لگتا ہے کہ تُم ہو۔

.... تحریر: محمد اشرف بھٹی ....

شعبہ شعروشاعر

حسن مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے

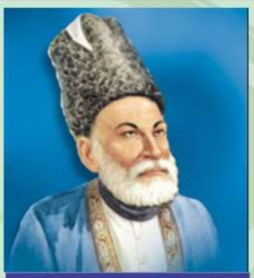

تحریر: مرزا غالب

حسن مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

گھر کی رونق

رضا نقوی واہی

ہم اپنے اہل سیاست کے دل سے قائل ہیں
کہ حق میں قوم کے وہ مادر مسائل ہیں

قدم قدم پہ نئے گل کھلاتے رہتے ہیں
طرح طرح کے مسائل اگاتے رہتے ہیں

کبھی یہ دھن ہے کہ صوبوں کی پھر سے ہو تشکیل
کبھی یہ ضد ہے کہ حد بندیاں نہ ہوں تبدیل

کبھی یہ شور کرو ختم چور بازاری
منافع خوروں کی لیکن نہ ہو گرفتاری

برائے بحث کھڑا ہے کبھی یہ ہنگامہ
لباس قوم کا دھوتی ہو یا کہ پاجامہ

ہر ایک بحث میں کچھ کشت وخوں ضروری ہے
نہیں تو جو بھی ہے تحریک وہ ادھوری ہے

ہر ایک فتنہ و شورش کا آخری جلوہ
مظاہرات و جلوس و تصادم و بلوہ

یونہی اٹھائی گئی بحث جب زباں کے لیے
سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لیے

وہ مسئلہ کہ جو دانش کدوں میں حل ہوتا
بلا سے آج اگر طے نہ ہوتا کل ہوتا

اسے بھی اہل سیاست نے کر لیا اغوا
اور اس کے بعد وہ سب کچھ ہوا جو ہونا تھا

نفاق و بغض و تعصب کے آ گئے ریلے
زباں کی آڑ میں اہل فساد کھل کھیلے

مخالفت میں ہوئی جا بہ جا صف آرائی
جلوس لے کے چلے اک طرف سے بلوائی

لبوں پہ غلغلۂ انقلاب زندہ باد
مگر دلوں میں دبائے ہوئے شرار فساد

دکانیں لوٹی گئیں راہ گیر مارے گئے
گھروں میں آگ لگی طفل و پیر مارے گئے

وہ پہلا شخص جو کھا کر چھرے کا زخم گرا
مزے کی بات تو یہ ہے، غریب گونگا تھا

مزید یہ کہ اسے جاں سے مارنے والے
کسی زبان سے واقف نہ تھے خودان پڑھ تھے

SARMAD GLOBAL
CHARTERED ACCOUNTANTS

ICAEW CHARTERED ACCOUNTANTS

QUALIFIED CHARTERED ACCOUNTANTS WITH BIG4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

- Company Incorporation / Registered Office Address
- Personal Income Tax Return investigations
- Rental Income Tax Returns
- UK State Pension Entitlement Review
- Advise on fil l ing Gaps in UK State Pension
- UK State Pension / (Contracted Out) Tracing
- Private UK Pension Tracing
- Assets Review for Inheritance Tax
- Appealing - Past years HMRC Penalties
- Preparation / Filing of prior year tax returns
- Duplicate - Payslips / P60s

SARMAD KHAN | ACA, FCCA

OFFICE 115 LONDON ROAD, MORDEN, SURREY SM4 5HP - UK

CELL +44 (0)7903 416 966

TEL +44 (0)208 646 3666 **FAX** +44 (0)208 082 5002

EMAIL INFO@SARMADGLOBAL.COM **WEB** WWW.SARMADGLOBAL.COM